الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

کرنے والے ہمیشہ اپنا کام آج کے دن کرتے ہیں
اور نہ کرنے والے ہمیشہ اپنا کام کل کے دن

مارچ ۱۹۸۷
شمارہ ۱۲۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۲۴ مارچ ۱۹۸۷ء

فہرست

سبق آموز

حضرت امیر معاویہؓ نے ایک بار دمشق میں کچھ چادریں تقسیم کیں۔ ان میں سے ایک چادر دمشق کے ایک بوڑھے آدمی کو پہونچی جو انصار سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ چادر انصاری بزرگ کو پسند نہیں آئی۔ انھوں نے غصہ میں آکر کہا کہ خدا کی قسم، میں اس چادر کو معاویہ کے سر پر ماروں گا۔ (واللّٰہ لاضربنّ بھا رأس معاویۃ)

حضرت امیر معاویہ اس وقت عظیم اسلامی سلطنت کے خلیفہ تھے۔ انھیں یہ بات پہونچی تو وہ اس کو سن کر غصہ نہیں ہوئے۔ اس کے برعکس جو کچھ پیش آیا وہ واقعہ بیان کرنے والے کے الفاظ میں یہ تھا:

فاستدعاہ الخلیفۃ وکشف لہ عن رأسہ وقال اَوفِ بیمینک ولیرأف الشیخ بالشیخ (الدعوۃ ۱۲ جمادی الاول ۱۴۰۷)

حضرت امیر معاویہ نے اس انصاری بزرگ کو اپنے یہاں بلایا اور ان کے سامنے اپنا سر کھول دیا اور کہا کہ اپنی قسم پوری کرو۔ البتہ ایک بوڑھے کو چاہیے کہ وہ دوسرے بوڑھے پر نرمی کرے۔

انصاری نے شرمندہ ہو کر معافی مانگی اور خاموشی کے ساتھ واپس چلے گیے۔

حضرت امیر معاویہ اگر اس کے جواب میں خود بھی غصہ ہو جاتے اور مذکورہ شخص کے خلاف انتقامی کارروائی کرتے تو مسئلہ اور بڑھتا۔ دونوں طرف سے کشیدگی میں اضافہ ہوتا۔ پورے سماج میں منفی رجحانات جنم پاتے۔ مگر انھوں نے اس سے کوئی منفی اثر نہیں لیا اور غصہ کا جواب ٹھنڈک سے دیا تو فریق ثانی خود جھک گیا۔ مزید یہ کہ پورا سماج منفی رجحانات کی پرورش سے بچ گیا۔

حضرت امیر معاویہ سوچ سکتے تھے کہ اگر میں مذکورہ رویہ اختیار کروں تو رعایا کے اوپر خلیفہ کا دبدبہ ختم ہو جائے گا اور حکومت کا نظم قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ مگر یہ نہایت سطحی سوچ ہے۔ ایسا تاریخ میں کبھی نہیں ہوا، اور نہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاملہ اس عام مفروضہ کے بالکل برعکس ہے۔ اس دنیا میں اس سے زیادہ طاقتور کوئی شخص نہیں جو سختی کا جواب نرمی سے دے۔ جو سرکشی کے جواب میں فریق ثانی کو نرمی اور محبت کا تحفہ پیش کرے۔

نازک پارسل

آپ نے دیکھا ہوگا کہ سامانوں کے بعض پارسل پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ احتیاط سے اٹھاؤ (Handle with care) یہ وہ پارسل ہیں جن میں کوئی نازک چیز (مثلاً شیشہ) پیک ہوتا ہے۔ اس طرح کے پارسلوں کے ساتھ اگر بے احتیاطی کا طریقہ اختیار کیا جائے تو ان کے اندر کا سامان ٹوٹ سکتا ہے۔ اس لیے ایسے پارسلوں کے اوپر یہ ہدایت لکھ دی جاتی ہے کہ ان کو اٹھانے اور رکھنے میں احتیاط کرو۔

پارسلوں میں تو ایسے پارسل بہت کم ہوتے ہیں جن کے ساتھ اس قسم کا نازک مسئلہ وابستہ ہو۔ مگر آج کل کے انسانوں کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام لوگ اسی قسم کے نازک پارسل ہیں۔ ہر آدمی گویا مسٹر پرابلم (Mr. Problem) یا مسٹر ہینڈل ودھ کیر (Mr Handle with care) بنا ہوا ہے۔

یہ وہ انسان ہیں جن کے ساتھ ذرا سا بھی کوئی خلاف مزاج بات پیش آجائے تو وہ فوراً بگڑ جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے خلاف اس قسم کی شکایتیں لیے پھرتے ہیں کہ اس نے یہ کہہ دیا، اس نے وہ کہہ دیا۔ ایسے لوگ خدا کی زمین پر بوجھ ہیں۔ ان کے ذریعہ کبھی کوئی طاقت ور سماج نہیں بن سکتا۔

بہترین انسان وہ ہے جو لوہے کی مانند ہو۔ جس کو آہستہ رکھیے تب بھی وہ لوہا رہتا ہے اور اگر زور سے پٹک دیجئے تب بھی وہ لوہا رہتا ہے۔ وہ جھٹکوں سے غیر متاثر رہ کر جینا جانتا ہے۔ رسول اللہؐ کے اصحاب ایسے ہی لوہا صفت انسان تھے۔ وہ اس قسم کی باتوں سے بہت اوپر اٹھ گئے تھے۔ عمر فاروقؓ نے خلیفۂ اول ابوبکر صدیقؓ کے ایک فرمان کو کھلے عام پھاڑ ڈالا (مزقہ عمر) مگر خلیفہ اول نے اس کو کچھ بھی برا نہیں مانا۔ عائشہ صدیقہؓ نے ایک صحابی (ابوہریرہؓ) کے متعلق کہہ دیا کہ ابوہریرہ نے جھوٹ کہا (کذب ابوھریرۃ) مگر صحابی نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا، وغیرہ۔

سیرت کی کتابوں میں اس طرح کے سیکڑوں واقعات ملتے ہیں۔ ایک صحابی کو دوسرے صحابی سے بار بار ناموافق تجربہ ہوتا تھا مگر وہ لوگ اس کا اثر لیے بغیر آپس میں بھائی بھائی بنے رہتے تھے۔ وہ اس طرح کی باتوں کی بالکل پروا نہیں کرتے تھے۔ اصحاب رسول اگر آج کل کے لوگوں کی طرح نازک پارسل ہوتے تو وہ کبھی وہ طاقت ور انقلاب برپا نہیں کر سکتے تھے جس نے تاریخ عالم کے رُخ کو موڑ دیا۔

گہرا کام

لندن میں ۱۸۸۳ میں فیبین سوسائٹی (Fabian Society) قائم ہوئی۔ اس کا مقصد صنعتی انقلاب سے پیدا شدہ معاشی نابرابری کو ختم کرنا تھا۔ اور سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ سوشلزم کے انداز کا نظام لانا تھا۔ اس سوسائٹی میں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوئے ان میں سے ایک جارج برنارڈ شا (۱۸۵۶ - ۱۹۵۰) تھا۔ برنارڈ شا بہت موثر تقریر کرتا تھا۔ اس نے اپنی تقریروں اور مضامین کے ذریعہ اس تحریک کے گرد ایک بھیڑ جمع کر لی اس کے بعد اس نے عوامی مظاہرہ کا منصوبہ بنایا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک جلوس نکالا۔ اس جلوس میں زیادہ تر درمیانی طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ یہ لوگ جب مارچ کرتے ہوئے لندن کے ان علاقوں میں پہونچے جہاں بڑے بڑے دولت مند رہتے تھے تو ان کے کچھ افراد تشدد پر اتر آئے اور توڑ پھوڑ کرنے لگے۔

اس پہلے تجربہ کے بعد ہی برنارڈ شا جلوس اور مظاہرہ کا سخت مخالف ہو گیا۔ اس نے کہا کہ عوام کو "پُرامن مظاہرہ" کا پابند رکھنا انتہائی حد تک مشکل ہے۔ اس لیے ہم اپنے مقصد کے لیے مظاہرہ کے بغیر جدوجہد کریں گے۔ اس کے بعد فیبین سوسائٹی پریس، اجتماعات، علمی ریسرچ وغیرہ جیسے غیر مظاہراتی طریقوں کی پابند رہ کر کام کرنے لگی۔ فیبین سوسائٹی نے جارج برنارڈ شا اور اس کے ساتھیوں کی رہنمائی میں تدریجی طریقہ کار کی ناگزیریت (Inevitableness of gradualism) پر زور دیا۔ اس تحریک کے لوگ سوشلزم کو مانتے ہیں مگر وہ ارتقائی سوشلزم پر عقیدہ رکھتے ہیں ہے نہ کہ انقلابی سوشلزم پر:

> The Fabians put their faith in evolutionary Soeialism rather than in revolution (EB–IV/20).

غیر مظاہراتی طریق عمل اختیار کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ موجودہ دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ اس کام میں اپنے آپ کو روکنا پڑتا ہے۔ توسیع کے بجائے استحکام پر قانع ہونا پڑتا ہے۔ شہرت اور مقبولیت کے مواقع ہوتے ہوئے اپنے آپ کو گم نامی میں دفن کرنے کے لیے راضی ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ فیبین سوسائٹی کے ساتھ یہ سب کچھ پیش آیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فیبین سوسائٹی

نے برطانیہ میں اپنی ایک زبردست تاریخ بنائی ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ برطانی عظمت کو قائم رکھنے کے لیے اسے اپنی ذاتی عظمت سے دستبردار ہونا پڑا۔

چنانچہ فیبین سوسائٹی کبھی برطانیہ کی عوامی تحریک نہ بن سکی۔ ۱۹۴۶ کا زمانہ اس کے عروج کا زمانہ شمار کیا جاتا ہے۔ مگر اس عروج کے زمانہ میں بھی فیبین سوسائٹی کے ممبروں کی تعداد ساڑھے آٹھ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ وہ ہمیشہ "خواص" کی تحریک شمار کی جاتی رہی۔ اس طریق کار کے بارہ میں اس کے اندر رائے کے اختلافات بھی ہوئے۔ اس کے کچھ ممبروں نے اصرار کیا کہ تحریک کو عوامی انداز پر چلایا جائے۔ مگر سوسائٹی کے رہنماؤں نے اس کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ فیبین سوسائٹی نے اپنی فکری سرگرمیوں کے ذریعہ برطانیہ کے ذہین طبقہ پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ ملک کی عام آبادی میں اس کے ارکان کی تعداد اگرچہ ایک فی صد سے بھی کم تھی مگر یہ تمام لوگ اعلیٰ ذہنی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اگلے مرحلہ میں برطانیہ کی لیبر پارٹی میں شریک ہوگیے۔ وہ لیبر پارٹی کا دماغ بن گیے۔ چنانچہ ۱۹۴۵ کے انتخابات میں لیبر پارٹی برطانیہ میں برسراقتدار آئی تو اس کے ممبران پارلیمنٹ کی نصف تعداد وہ تھی جو فیبین سوسائٹی سے تعلق رکھتی تھی۔ وزیر اعظم ایٹلی بھی اس کے ایک ممبر تھے۔

۱۹۴۵ سے پہلے برطانیہ میں سرونسٹن چرچل کی پارٹی برسراقتدار تھی۔ چرچل وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز تھے۔ انھوں نے برطانی مقبوضات کو آزاد کرنے کا مطالبہ یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ: میں یہاں اس لیے نہیں ہوں کہ سلطنت برطانیہ کے خاتمہ کی تقریب کی صدارت کروں۔ مگر فیبین سوسائٹی کے افراد کے زیر اثر لیبر پارٹی نے پورے معاملہ پر از سر نو غور کرنا شروع کیا۔ ان کے حقیقت پسندانہ انداز فکر نے انھیں بتایا کہ نو آبادیاتی مقبوضات کو آزاد کرنا برطانیہ کے لیے کھونے سے زیادہ پانے کے ہم معنی ہے۔ فیبین دماغ کے تحت ہی برطانیہ کے لیے یہ ممکن ہوا کہ ۱۹۴۷ میں ہندستان کو پُرامن طور پر آزاد کر کے برصغیر میں اپنے مفادات کو از سر نو محفوظ کرلے۔

عوامی اشو کھڑا کر کے بھیڑ اکٹھا کرلینا بہت آسان ہے۔ مگر اس قسم کی بھیڑ کبھی تاریخ نہیں بناتی۔ تاریخ بنانے کے لیے ہمیشہ اعلیٰ ذہن درکار ہوتے ہیں۔ اعلیٰ ذہن کو جمع کرنے کی واحد کی تدبیر یہ ہے کہ عوامی انداز کے ہنگاموں سے بچا جائے اور تحریک کو اول سے آخر تک سنجیدہ فکری انداز میں چلایا جائے۔

انسانی دماغ

ایک سائنس داں نے انسانی دماغ کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ انسانی دماغ ہمارے تمام کمپوٹر اور سُپر کمپوٹر سے بے حساب گنا زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اگر ایک ایسا دیو پیکر کمپوٹر بنایا جائے جس کا ساز و سامان (Infrastructure) سات منزلہ بلڈنگ میں پھیلا ہوا ہو تو وہ انسانی دماغ کا صرف ایک سادہ خاکہ (Rough sketch) ہوگا۔

ایک اور سائنس داں نے لکھا ہے کہ انسانی دماغ ۱۰ بلین سے لے کر ۱۵ بلین الگ الگ اعصابی خلیوں یا نیورون پر مشتمل ہوتا ہے، یعنی دنیا کی موجودہ آبادی سے پانچ گنا زیادہ۔ اس کے مقابلہ میں شہد کی ایک مکھی کے دماغ کے خلیوں کی تعداد ۹۰۰ ہوتی ہے اور چیونٹی کے دماغ کے خلیوں کی تعداد صرف ۲۵۰:

> The brain of man contains between 10 and 15 billion separate nerve cells or neurons, just about five times the present population of the world. By comparision, the brain of a bee has 900 cells and that of an ant only 250. (*The Hindustan Times*, 21 February 1982)

ایک مرد کے دماغ (Brain) کا وزن تقریباً ۱۴۰۰ گرام ہوتا ہے۔ اس مختصر مادہ میں اتنے حیرت ناک اوصاف بھرے ہوئے ہیں جن کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ دماغ آدمی کے جسم کی تمام سرگرمیوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ وہ سوچتا ہے اور فیصلے کرتا ہے۔ وہ نئی نئی باتیں دریافت کرتا ہے۔ وہ ہر قسم کی معلومات کو بے اندازہ مقدار میں اپنے حافظہ کے خانہ میں جمع رکھتا ہے اور عین وقت پر اس کو نکال کر ذہن کے حوالے کر دیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

دماغ کا یہ معجزانہ واقعہ ایک برتر دماغ (خدا) کی موجودگی کا ثبوت ہے۔ اگر ایک برتر دماغ رکھنے والا خالق موجود نہ ہو تو دماغ جیسی حیرت ناک چیز وجود میں نہیں آسکتی۔

جانوروں میں بھی ذہانت ہوتی ہے۔ مثلاً بیور (Beavers) بند کی قسم کے پُل بناتے ہیں۔ چڑیاں گھونسلے بناتی ہیں۔ شہد کی مکھیاں چھتہ بناتی ہیں۔ مگر یہ تمام جانور ہمیشہ ایک ہی قسم کی چیز بناتے ہیں۔ وہ سوچ کر اس میں کوئی فرق کرنا یا اس میں کوئی ارتقاء کرنا نہیں جانتے۔ جب کہ انسان سوچتا ہے۔

آخرت کا معاملہ

ستمبر ۱۹۸۶ میں مجھے دہلی کی ایک کانفرنس میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ اس کانفرنس کا افتتاح ایک انتہائی اعلیٰ سیاسی شخصیت کے ذریعہ ہونے والا تھا۔ اس بنا پر وہاں حفاظت کا غیر معمولی انتظام تھا۔ اجتماع گاہ میں داخل ہونے والے ہر شخص کی جانچ الکٹرانک آلات کے ذریعہ ہو رہی تھی۔ میں جب اجتماع گاہ کے گیٹ پر پہونچا تو فوراً حفاظتی پولیس کے کئی آدمی میری طرف بڑھے تاکہ میری باقاعدہ جانچ کریں۔ مگر اس وقت میرے ساتھ کانفرنس کی انتظامیہ کمیٹی کے ایک اعلیٰ عہدیدار (مسٹر بجاج) تھے۔ انھوں نے فوراً مداخلت کی اور کہا: انھیں اندر آنے دو، ان کی جانچ نہیں کرنی ہے۔

جب یہ واقعہ ہوا تو اچانک مجھے قیامت کا منظر یاد آگیا۔ میں نے سوچا کہ آخرت میں اسی طرح جب آدمی آگے کی طرف بڑھنا چاہے گا تو خدا کے فرشتے فوراً اس کو جانچ کے لیے روک لیں گے۔ اس وقت وہی شخص بچے گا جس کے متعلق خدا یہ کہہ دے کہ اس کی جانچ مت کرو۔ اس کو اندر آنے دو۔ اس کے برعکس جو شخص جانچ کرنے والے فرشتوں کے حوالے کر دیا گیا اس کی نجات کی کوئی صورت نہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں وہی لوگ نجات پائیں گے جن کا آسان حساب (حساب یسیر) لیا جائے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص جانچا گیا وہ ہلاک ہوا (مَنْ نوقش فقد هلك) ایک اور حدیث میں ہے کہ قیامت میں کوئی شخص اپنے عمل سے نہیں بچ سکتا، وہاں صرف وہ شخص بچے گا جس کو اللہ اپنی رحمت اور فضل کے سایہ میں ڈھانپ لے۔

آدمی کو اگر قیامت میں پیش آنے والی اس سنگین صورت حال کا احساس ہو تو دنیا میں اس کا رویہ بالکل بدل جائے گا۔ کسی بھائی کو وہ سختی میں مبتلا ہوتے ہوئے دیکھے گا تو اس کے لیے ناممکن ہو جائے گا کہ وہ اس کے معاملہ میں غیر جانبدار ہو جائے۔ کیوں کہ وہ ڈرے گا کہ موت کے بعد جب جانچ کے فرشتے اس کی طرف بڑھیں گے اس وقت خدا اگر میرے معاملہ میں غیر جانبدار ہو جائے تو میرا کیا انجام ہوگا۔ اس کے بعد کون سی دنیا ہوگی جہاں مجھے پناہ مل سکے۔

اختلاف کا سبب

خباب بن الارت کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار معمول کے خلاف بہت لمبی نماز پڑھی۔ صحابہ نے اس کی بابت سوال کیا تو فرمایا: یہ رغبت اور خوف کی نماز تھی۔ میں نے اس میں اللہ سے تین دعائیں کیں۔ ان میں سے دو قبول ہو گئیں۔ ایک کے بارہ میں انکار کر دیا گیا۔

فرمایا: میں نے پہلی دعا یہ کی کہ میری ساری امت قحط سے ہلاک نہ ہو جائے۔ یہ قبول ہو گئی۔ دوسری دعا یہ کی کہ میری امت پر کوئی ایسا دشمن مسلط نہ ہو جو ان کو بالکل مٹا دے۔ یہ بھی قبول ہو گئی۔ تیسری دعا یہ کی کہ میری امت کے اندر آپس میں لڑائی جھگڑے نہ ہوں۔ یہ قبول نہیں ہوئی۔

اس کی تصدیق ایک اور روایت سے ہوتی ہے:

عن جابرٍ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان الشیطانَ قد اَیِسَ من اَن یَعبُدَہ المصلّون فی جزیرۃ العرب، ولکن فی التحریش بینھم
(رواہ مسلم، مشکوٰۃ باب فی الوسوسہ)

حضرت جابر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ مسلمان جزیرۂ عرب میں اس کی عبادت کریں۔ لیکن مسلمانوں کے درمیان دشمنی کی آگ بھڑکانے سے (وہ مایوس نہیں ہوا ہے)

نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ اندیشہ حیرت انگیز طور پر مسلمانوں کی بعد کی تاریخ میں صحیح ثابت ہوا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں یہ نفسیات کیوں ہے کہ شیطان بہت آسانی سے ان کو باہمی جدال کے بے فائدہ مشاغل میں الجھا دیتا ہے۔

اس کی وجہ اسلام کے بجائے اپنے آپ کو برحق سمجھ لینا ہے۔ مسلمان اگر اسلام کو برحق سمجھیں تو سب کا مرکز توجہ ایک ہوتا ہے۔ یہ ذہن تمام لوگوں کو اسلام پر متحد کر دیتا ہے۔ مگر دور زوال میں یہ ہوتا ہے کہ ہر مسلمان اپنے آپ کو برحق سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں مرکز تقسیم ہوتا ہے اور لوگ ایک دوسرے سے الگ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مسلمان اسلام کو سچا سمجھیں تو اس سے اتحاد پیدا ہوتا ہے، اور اگر وہ اپنے آپ کو سچا سمجھیں تو اس سے اختلاف۔

ایک حدیث

عن ابی ھُریرۃ رضی اللہ عنہ اَنّہٗ سَمِعَ النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول : اِنَّ العبدَ لیتکلّم بالکلمۃِ مایَتَبَیَّنُ فیھا یَزِلُّ بھا الی النّارِ ابعدَ مما بین المشرقِ والمغرب۔ (متفق علیہ)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ بندہ بے سوچے سمجھے بات کہتا ہے، اس کی وجہ سے وہ جہنم میں گر کر اس سے بھی زیادہ دور چلا جاتا ہے جتنا مشرق اور مغرب میں فاصلہ ہے۔

تَبَیَّنَ یَتَبَیَّنُ کے معنی عربی زبان میں غور کرنے کے ہیں۔ یعنی بولنے سے پہلے یہ سوچنا کہ آدمی جو کچھ کہنے جا رہا ہے وہ ٹھیک ہے یا بے ٹھیک۔ اس حدیث کے مطابق بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو بظاہر آدمی معمولی سمجھتا ہے مگر وہ اتنی سنگین ہوتی ہیں کہ آدمی کو جہنم میں گرانے کا سبب بن جاتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کچھ باتیں پر اسرار طور پر بری ہیں۔ یعنی بظاہر ان کا برا ہونا آدمی کو معلوم نہیں ہوتا۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے وہ اللہ کے یہاں بری قرار پا جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر بری بات کا برا ہونا لوگوں کو معلوم ہے۔ البتہ جو بات لوگوں کو معلوم نہیں ہے وہ یہ کہ ایک بری بات جس طرح ایک ایسے شخص کے حق میں بولنا غلط ہے جو ہماری اچھی فہرست میں شامل ہو، اسی طرح اس شخص کے لیے بھی اس کو بولنا غلط ہے جو ہماری بری فہرست میں چلا جائے۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ جس آدمی سے وہ خوش ہوں اس کے بارے میں بولنا ہو تو وہ سوچے سمجھے الفاظ اپنی زبان سے نکالتے ہیں۔ مگر جس شخص سے ان کو شکایت ہو جائے یا جس کو وہ کسی وجہ سے حقیر سمجھ لیں اس کے بارہ میں وہ کسی احتیاط کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ایسے شخص کے معاملہ میں وہ بلا تحقیق کوئی بھی برا لفظ بول دیں گے۔ ایسے شخص پر وہ کوئی بھی بے بنیاد الزام لگا دیں گے اور یہ نہیں سوچیں گے کہ دلیل اور ثبوت کے بغیر کسی شخص پر الزام لگانا کسی بھی حال میں کسی کے لیے جائز نہیں۔ خواہ وہ لوگوں کی نظر میں کتنا ہی بڑا بزرگ کیوں نہ ہو۔ خواہ بظاہر اس نے دین یا دنیا کے کتنے ہی بڑے کارنامے انجام دیئے ہوں۔

حسد کے بجائے دعا

لطیفہ ہے کہ ایک غریب دیہاتی تھا۔ وہ معاشی اعتبار سے بہت پریشان رہتا تھا۔ کسی شخص نے اس سے کہا کہ تم اکبر بادشاہ کے پاس جاؤ۔ اس کے پاس بہت پیسہ ہے اور وہ ہر مانگنے والے کو دیتا ہے۔ وہ تم کو بھی ضرور دے گا اور تمہارا معاشی مسئلہ حل ہو جائے گا۔ دیہاتی آدمی نے کہا کہ اکبر بادشاہ کو کس نے دیا ہے۔ بتلانے والے نے بتایا کہ خدا نے۔ دیہاتی نے کہا کہ پھر ہم خدا ہی سے کیوں نہ مانگیں، ہم اکبر سے کیوں مانگیں۔

اس کے بعد وہ ایک روز اپنے گھر سے نکلا اور سنسان جنگل کی طرف چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے اپنا میلا کپڑا زمین پر بچھایا اور اس پر بیٹھ کر خدا سے دعا کرنے لگا۔ اس نے اپنی دیہاتی زبان میں کہا: اے اکبر کو دینے والے، مجھے بھی دیدے۔ وہ اسی طرح دعا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ فارغ ہوا اور اس نے اپنا کپڑا اٹھایا تو اس کے نیچے اشرفیوں کی بھری ہوئی تھیلی موجود تھی۔ یہ لطیفہ بتاتا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے دماغ اور اونچے پڑھے لکھے لوگ اپنے شعور اور کردار کے اعتبار سے اس سطح پر بھی نہیں ہیں جہاں مذکورہ دیہاتی آدمی تھا۔

آج یہ حالت ہے کہ جب بھی کوئی شخص یہ دیکھتا ہے کہ دوسرا آدمی اس سے بڑھ گیا ہے، خواہ یہ بڑھنا مال کے اعتبار سے ہو یا حیثیت کے اعتبار سے، تو فوراً وہ حسد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے سینے میں بڑھنے والے آدمی کے خلاف نفرت اور جلن کی کبھی نہ ختم ہونے والی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ حسد اور جلن میں مبتلا ہونے والے لوگ اگر یہ سمجھیں کہ کسی کو جو کچھ ملا ہے وہ خدا کے دیئے سے ملا ہے، وہی کم بھی دیتا ہے اور وہی زیادہ بھی دیتا ہے، تو وہ بھی وہی کریں جو مذکورہ دیہاتی نے کیا۔ وہ پانے والے انسان کے بجائے دینے والے خدا کی طرف دوڑیں۔ وہ خدا کو پکارتے ہوئے کہیں کہ جس طرح تو نے میرے بھائی کو دیا ہے اسی طرح تو مجھے بھی دیدے۔ اگر لوگوں میں یہ مزاج آجائے تو سماج کی تمام برائیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

کسی کی بڑائی کو دیکھ کر اپنی کمی کا احساس ابھرنا بذات خود ایک فطری جذبہ ہے۔ اس جذبہ کا رخ اگر خدا کی طرف ہو تو وہ صحیح ہے اور اگر اس کا رخ آدمی کی طرف ہو تو غلط۔

جہاد یا سرکشی

بنگلور کے انگریزی اخبار دکن ہرالڈ (۷ دسمبر ۱۹۸۶) نے ایک کہانی چھاپی جس میں پیغمبر اسلامؐ کے خلاف گستاخی کا پہلو پایا جاتا تھا۔ اس پر مقامی مسلمان بگڑ گیے۔ انھوں نے اخبار کا گُدام جلا ڈالا جس میں ایک کروڑ روپیہ کا کاغذ رکھا ہوا تھا۔ پاکستان کے انگریزی اخبار فرنٹیر پوسٹ (۹ جنوری ۱۹۸۷) میں کسی مغربی پرچہ سے ایک مضمون نقل کیا گیا۔ اس کے ساتھ آدم اور حوا کی ایک تصویر تھی وہ بھی فرنٹیر میل میں چھپ گئی۔ اس کے بعد ڈیڑھ ہزار کی تعداد میں بپھرے ہوئے مسلمانوں نے اخبار کی وسیع عمارت کو گھیر لیا اور اس کو سازوسامان سمیت جلا کر خاکستر کر دیا۔

اس قسم کے واقعات ایک یا دوسری شکل میں ہر اس ملک میں ہو رہے ہیں جہاں مسلمانوں کو عمل کی آزادی حاصل ہے۔ مسلمان اپنی ملی ہوئی آزادی کو اسی قسم کی تخریب کاری میں استعمال کر رہے ہیں اور اس کا نام انھوں نے اسلامی جہاد رکھا ہے۔

اس قسم کا ہر عمل بلاشبہہ غیر اسلامی عمل ہے۔ یہ جہاد نہیں بلکہ سرکشی ہے اور سرکشی اللہ تعالیٰ کے یہاں بدترین جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس معاملہ کی شرعی حیثیت کو سمجھنے کے لیے ایک حدیث کا مطالعہ کیجیے:

عَن ابی هُرَیرةَ، قَال: اِنَّ رَسولَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰه عَلیهِ وسلم اُتِیَ بِرجلٍ قَدْ شَرِبَ الخمرَ فقَال: "اِضربوهُ" فمنَّا الضاربُ بیدِهٖ، وَالضاربُ بثوبِه. وَالضاربُ بنعلِه. ثُمَّ قال: "بکتوه" فَاقبلُوا علیهِ یَقولونَ: ما اتَّقیتَ اللّٰهَ، ما خشیتَ اللّٰهَ، وَمَا استحییتَ من رَسول اللّٰهِ صَلَّی اللّٰه عَلیهِ وَسلَّم. فَقَالَ بَعضُ القَومِ: اَخزَاكَ اللّٰهُ. قَال: "لَا تَقولُوا هٰکذا، لَا تُعینوا علیهِ الشیطٰنَ ولٰکِن قُولُوا: اَللّٰهُمَّ اغفِرلَه، اَللّٰهُمَّ ارحَمه" رواه ابوداود

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا۔ وہ شراب پیے ہوئے تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو مارو۔ پس ہم میں سے کوئی شخص اس کو ہاتھ سے مارنے لگا اور کوئی شخص کپڑے سے اور کوئی شخص جوتے سے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اس کو عار دلاؤ۔ پس لوگ کہنے لگے کیا تم کو ڈر نہیں، کیا تم کو اللہ کا خوف نہیں، کیا تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرم نہیں آئی۔ پھر حاضرین میں سے بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ خدا تمہیں رسوا کرے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا

کہ اس طرح مت کہو۔ اس کے مقابلہ میں شیطان کے مددگار نہ بنو۔ بلکہ یہ کہو کہ اے اللہ اس کی مغفرت فرما۔ اے اللہ اس پر رحم فرما۔

اس حدیث سے چند باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ صحابۂ کرام نے جب ایک شاربِ خمر کو دیکھا تو وہ خود اس کو مارنے نہیں لگے۔ بلکہ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے جو اس وقت مدینہ میں صاحبِ امر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اگر ایک ایسا فعل کرے جو ثابت شدہ شرعی جرم کی حیثیت رکھتا ہو تب بھی عوام کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بطور خود اس پر مقررہ سزا کا نفاذ شروع کر دیں۔ سزا کے نفاذ کا حق صرف صاحبِ امر کو ہے۔ اور اسی کی طرف معاملہ کو لوٹایا جانا چاہیے۔

دوسری بات یہ کہ ایک ثابت شدہ مجرم کو سزا دینے کا کام بھی خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس کو صرف "سزا" دی جائے، اس کو "ذلیل" نہ کیا جائے۔ کوئی بھی قولی یا عملی روش جو ذلیل کرنے کے ہم معنی ہو وہ مجرم کے اندر منفی نفسیات پیدا کرے گی۔ مجرم کو سزا دینے کے ساتھ ذلیل و رسوا کرنا صرف اس قیمت پر ہوگا کہ وہ دین اور اہلِ دین سے متنفر ہو جائے۔ اس طرح کی روش کے نتیجہ میں اس کے اندر ضد اور نفرت کا جذبہ بھڑک اٹھے گا۔ اس سے پہلے اگر وہ حق سے ایک قدم دور تھا تو اب وہ اس سے سو قدم دور ہو جائے گا۔ شیطان اس کے اندر مخالفانہ جذبات بھڑکا کر اس کو اپنا شکار بنالے گا۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات ہے جس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ وہ یہ کہ کسی جرم کی شرعی سزا وہی ہے جو کتاب وسنت سے ثابت ہو۔ اس کے سوا کوئی اور سزا دینا یقینی طور پر فعلِ حرام کی حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً شاربِ خمر کے لیے اگر شریعت میں یہ سزا مقرر کی گئی ہے کہ اس آدمی کو مارا جائے جس نے شراب پی ہے تو کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ شاربِ خمر کے بھائی بہنوں کو مارنے لگے، یا وہ شاربِ خمر کا گھر جلانے لگے، یا وہ اس کے کارخانے کو لوٹنا شروع کر دے۔

سزا نافذ کرنے والے ادارہ کا کام صرف یہ ہے کہ جب ایسا کوئی کیس سامنے آئے تو وہ تحقیق کرے۔ جب تحقیق اور شہادت سے ثابت ہو جائے کہ متعلقہ شخص فی الواقع مجرم ہے تو ایسے جرم کے لیے شریعت کی جو مقررہ سزا ہے اس کو اس شخص پر نافذ کرے۔ کوئی دوسری سزا نافذ کرنا شریعت کی تعمیل نہیں بلکہ شریعت

سے بغاوت ہے۔ ایسا شخص خود سب سے بڑا مجرم ہے، اس کو حق نہیں کہ کسی دوسرے شخص کو مجرم قرار دے کر اس کے اوپر اپنی خود ساختہ سزا کا نفاذ کرنے لگے۔

زمانہ جاہلیت میں یہود اور اہل عرب نے یہ دستور بنا رکھا تھا کہ وہ اونچے خاندان کے مجرم اور نیچے خاندان کے مجرم کے درمیان سزا میں فرق کرتے تھے۔ اس پر قرآن میں قصاص کی آیت (البقرہ ۱۷۸) اُتاری گئی۔ اس میں کہا گیا کہ اے ایمان والو، تم پر مقتولین کے معاملہ میں برابری اور مساوات کو فرض کیا گیا ہے۔ سزائے قتل کے معاملہ میں جو لوگ قصاص (برابری) کے شرعی اصول کو اختیار نہ کریں۔ یا مثلاً معافی اور دیت قبول کرنے کے بعد مزید یہ کریں کہ وہ قاتل کو قتل کر ڈالیں تو یہ اعتدار (زیادتی) ہے اور اس قسم کا اعتدار کرنے والوں کے لیے خدا کے یہاں دردناک عذاب ہے۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص قتل کیا جائے تو اس کے وارثوں کے لیے تین میں سے ایک چیز ہے۔ قصاص، یا معاف کر دینا، یا دیت لینا۔ اس کے بعد اگر وہ کوئی چوتھی چیز چاہے تو اس کا ہاتھ پکڑ لو۔ جو اس کے بعد بھی زیادتی کرے تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا (ومن اعتدیٰ بعد ذالک فلہ نار جھنّم خالدا فیھا، تفسیر ابن کثیر جلد اوّل)

اس حکم شریعت کے مطابق جرم اور سزا میں برابری ہونا ضروری ہے۔ کسی مجرم کو حد شرعی سے زیادہ سزا دینا یا مقررہ سزا کے سوا کوئی اور سزا دینا سراسر حرام ہے۔ ایک شخص سے کوئی شرعی جرم سرزد ہو تو خود مجرم پر شرعی سزا کا نفاذ کیا جائے گا۔ اس کے بجائے اگر اس کے ہم قوموں کو مارا جانے لگے یا مجرم کی جائداد کو تباہ کیا جائے تو یہ سراسر فعل حرام ہے۔ جو لوگ ایسا کریں یا جو لوگ ایسا کرنے والوں کی حمایت کریں حتیٰ کہ جو لوگ ایسے فعل کو دیکھ کر خاموش رہیں وہ اپنے آپ کو اس خطرہ میں مبتلا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی سخت ترین باز پرس کی جائے۔

ملک کا اقتدار اگر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جن سے یہ امید نہ ہو کہ وہ مجرم کے اوپر شرعی سزا کا نفاذ کریں گے تب بھی مسلمانوں کے لیے قانون اپنے ہاتھ میں لینا جائز نہیں۔ ایسے ماحول میں مسلمانوں کے لیے نصیحت اور صبر ہے نہ کہ سزا کا نفاذ۔ یہ اصول مکی دور کے عمل سے ثابت ہے۔ اس وقت مکہ کے لوگ کھلے طور پر شراب پیتے تھے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے اصحاب نے ان پر حد جاری کرنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ حد کا نفاذ اقتدار ملنے کے بعد کیا گیا۔

گھر کا امام

قرآن میں جو دعائیں سکھائی گئی ہیں ان میں سے ایک دعا یہ ہے : اے ہمارے رب ، ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما ۔ اور ہم کو متقیوں کا امام بنا دے (ربنا ھب لنا من ازواجنا وذریاتنا قرۃ اعین واجعلنا للمتقین اماما)

یہ آیت دعا کے انداز میں بتا رہی ہے کہ اہلِ ایمان کا گھرانا کیسا ہوتا ہے اور ایک مومن کو اپنے گھر والوں کے ساتھ کس طرح رہنا چاہیے ۔ اس کا مطلب بدلے ہوئے الفاظ میں یہ ہے کہ گھر کے اندر جو معاملات پیدا ہوں ان میں ہم اپنے گھر والوں کو متقیانہ رہنمائی دیں ۔ ہم اپنے گھر والوں کو مفسدانہ رہنمائی دینے والے نہ بنیں ۔

گھر کی زندگی میں بار بار مختلف قسم کے واقعات پیش آتے ہیں ۔ ایسے مواقع پر گھر کے چھوٹے وہی کرتے ہیں جو گھر کے بڑے کریں ۔ گھر کے بڑے جس رُخ پر چلیں ، گھر کے چھوٹے بھی اسی رُخ پر چل پڑتے ہیں ۔ گھر کے معاملات میں گھر کا بڑا شخص گھر کا رہنما ہوتا ہے ۔ اگر اس بڑے شخص کے اندر فساد ہو تو اس کی مفسدانہ رہنمائی گھر کے تمام لوگوں کو مفسد بنا دے گی ۔ وہ مفسدوں کا امام بن کر ظاہر ہوگا ۔ اور اگر اس بڑے شخص کے اندر تقویٰ ہو تو اس کی متقیانہ رہنمائی سب کو متقی بنا دے گی ۔ وہ متقیوں کا امام بن کر ظاہر ہوگا ۔

مثال کے طور پر گھر والوں کو کسی سے شکایت پیدا ہو گئی ۔ اب گھر کا بڑا شخص اگر انصاف پسندی کا طریقہ اختیار کرے ، وہ ایسی بات کہے جس سے شکایتی ذہن دبے اور لوگوں کے جذبات ٹھنڈے ہوں تو ناخوش گوار واقعہ پیش آنے کے باوجود گھر کی فضا برہم نہیں ہوگی ۔ گھر کے تمام لوگ حقیقت پسندی اور خیر خواہی کے ساتھ اس کا استقبال کریں گے ۔ گھر کے لوگوں کی روش متقیانہ روش ہوگی اور گھر کا بڑا شخص صحیح رہنمائی کے ذریعہ ایک متقیانہ گھر کی امامت کر رہا ہوگا ۔

اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ کسی سے ایک شکایت پیدا ہوئی اور گھر کا بڑا شخص اس سے بھڑ اٹھا تو وہ بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرے گا ۔ اس کی منفی باتوں سے لوگوں کے اندر چھپے ہوئے

نفرت اور عداوت کے جذبات ابھر آئیں گے۔ گھر کے ہر فرد کا دماغ تخریبی سوچ کا کارخانہ بن جائے گا۔ گھر کے اندر معافی کے بجائے انتقام، اعراض کے بجائے ٹکراؤ کی باتیں ہونے لگیں گی۔ اپنی کمیوں کا اعتراف کرنے کا مزاج ختم ہو جائے گا۔ ہر شخص بس فریق ثانی کو برا بھلا کہنے میں مصروف ہوگا۔ یہ سب کچھ گھر کے بڑے شخص کی رہنمائی میں ہوگا۔ گھر کا بڑا شخص اپنی باتوں سے سب کے ذہن کو بگاڑ دے گا۔ گھر کے تمام لوگ مفسد بن جائیں گے اور وہ ان تمام مفسدوں کا امام۔

ھب لنا من ازواجنا وذریاتنا قرۃ اعین کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ ان کو نیک عمل بنا دے تاکہ انھیں دیکھ کر ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں (یعنی اجعلھم صالحین تقر بھم اعیننا التفسیر المظہری) اجعلنا للمتقین اماما کی تفسیر مفسرین نے یہ کی ہے کہ ہم کو نمونہ بنا دے جس کی پیروی متقی لوگ کریں (ای اجعلنا قدوۃ یقتدیٰ بنا المتقون، صفوۃ التفاسیر)

گھر کے بڑے کے اندر اگر یہ مزاج ہو کہ اپنے بیوی بچوں کو صالح دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہوں، اس کے لیے اپنے گھر کے اندر سب سے زیادہ محبوب منظر یہ ہو کہ اس کے بیوی بچے خدا پرستی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں۔ اگر ایسا ہو، جبھی یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کے لیے امام خیر بنے۔ امامِ خیر بننے کی ایک قیمت ہے۔ اور وہ قیمت دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دینا ہے۔ جو شخص یہ قیمت ادا کرے اسی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کے لیے امامِ خیر بن سکے۔

اس کے برعکس اگر گھر کے بڑے کی آنکھوں کی ٹھنڈک یہ ہو کہ اس کے بیوی بچوں کے گرد دنیا کی رونقیں جمع ہوں۔ اس کا سب سے زیادہ پسندیدہ منظر یہ ہو کہ اس کے گھر والے دنیوی ترقیوں کے گنبد پر کھڑے نظر آئیں تو وہ اپنے گھر والوں کے لیے صرف امامِ شر بن سکتا ہے۔ کیوں کہ امام شر بنے بغیر بیوی بچوں کی دنیوی خواہشات کی تکمیل ممکن نہیں۔

ایسا شخص لازماً مفاد پرستی کا طریقہ اختیار کرے گا۔ وہ ناجائز کو جائز بنائے گا۔ وہ اپنے بچوں کی خاطر خود سب سے پہلے غیر خدا پرست بنے گا۔ اور پھر اس کو دیکھ کر اس کے گھر والے بھی غیر خدا پرستانہ طریقہ پر چل پڑیں گے۔ اس کی روش آخر کار اس کو اپنے گھر والوں کے لیے شر کا امام بنا دے گی۔

یونانی علوم

سکندر اعظم (۳۲۳ - ۳۵۶ ق م) قدیم یونان کا بادشاہ تھا۔ اس نے ایران سے لے کر ترکستان اور چین تک بہت سے ممالک فتح کر ڈالے۔ اس کے بعد رومی ابھرے اور انھوں نے دوسرے ملکوں کے ساتھ یونان کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اب دونوں سلطنتیں ایک ہو گئیں۔ اس طرح یونانیوں اور رومیوں نے اسلام سے پہلے قدیم زمانہ کی سب سے بڑی سلطنت قائم کی۔ سیاسی کامیابیوں نے قوم کے اندر حوصلہ پیدا کیا۔ ان کی بڑھتی ہوئی خوشحالی نے انھیں علمی کام کے مواقع دیئے۔ ان حالات میں یونان میں فلسفہ اور دوسرے علوم کو فروغ حاصل ہوا۔ تاہم یہ فلسفہ زیادہ تر منطقی بحثوں اور دور از کار قیاس آرائیوں پر مشتمل تھا۔ قسطنطین کے بعد جب رومیوں نے عیسائیت قبول کی تو اس قسم کی کتابوں کو مذہب کے لیے مضر سمجھ کر ممنوع قرار دے دیا گیا۔

عباسی خلیفہ مامون الرشید کو فلسفیانہ کتابوں کی تلاش ہوئی تو اس نے شاہ روم کو خط لکھا کہ فلسفہ کے متعلق یونانی اور رومی مصنفین نے جو کچھ لکھا ہے ان کو بھیج دے۔ اس زمانہ کا رومی بادشاہ خود بھی اس قسم کی کتابوں سے بے خبر تھا۔ اس نے معلومات کیں تو ایک بوڑھے راہب نے اس کو ایک بند مکان کا پتہ دیا جہاں عیسائیت کے فروغ کے بعد فلسفہ کی تمام کتابیں لوگوں سے چھین کر رکھ دی گئی تھیں اور باہر سے اس پر بھاری تالا ڈال دیا گیا تھا۔ شاہ روم نے راہب سے پوچھا، کیا یہ کتابیں مسلمانوں کے ملک میں بھیج دی جائیں۔ راہب نے جواب دیا: آپ ضرور ان کو مسلمانوں کے پاس بھیج دیں۔ کیوں کہ یہ کتابیں جس قوم میں پڑھی جائیں گی اس کو لایعنی بحثوں میں الجھا کر اس کے عقائد کو متزلزل کر دیں گی اور نتیجۃً اس قوم کی کمزوری کا باعث ہوں گی۔ چنانچہ شاہ روم نے یہ کتابیں اس مکان سے نکالیں اور ان کو پانچ اونٹوں پر لاد کر بغداد کی طرف روانہ کر دیا۔ جمال الدین قفطی نے لکھا ہے:

ووجدوا فيه كتبا كثيرة فاخذوا	ان کو اس گھر میں بہت سی کتابیں ملیں۔
من جانبها بغير علم وفحص خمسة	انھوں نے کسی تحقیق و جستجو کے بغیر ایک طرف

سے پانچ بوجھ کے بقدر کتابیں لیں اور ان کو مامون کے پاس بھیج دیا۔ — احمال وسیرت الی المامون (اخبار الحکماء)

عیسائی راہب کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ دوسری صدی ہجری میں اس قسم کی کتابوں کے اثر سے مسلمان قرآن کے فطری اسلوب سے ہٹ گیے۔ قرآن میں استدلال کی بنیاد حقائق فطرت پر رکھی گئی تھی، قدیم فلسفیانہ کتابوں سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے استدلال کی بنیاد قیاسی منطق پر رکھ دی۔ یہ طریق بحث اور طرز استدلال سراسر قرآن سے ہٹا ہوا تھا۔ مگر بعد کو وہ مسلمانوں کے دینی تعلیم کے نصاب میں شامل ہو کر دھیرے دھیرے مقدس بن گیا۔ اس واقعہ کو اب ایک ہزار سال سے زیادہ ہو رہے ہیں مگر آج بھی مسلمان منطق و فلسفہ کے اس طلسم سے نکلنے کے لیے تیار نہیں۔

مسلمانوں کے اوپر اس غیر اسلامی علم کے ابدی تسلط کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی صدیوں کے بعد مسلمانوں کے جو علوم مدون ہوئے وہ تمام تر اسی منطقی اسلوب میں مدون ہوئے۔ یہ طرز ہمارے علوم میں اتنا زیادہ دخیل ہوا کہ اب ایک شخص جو قدیم منطق میں کافی درک نہ رکھتا ہو وہ ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ مثلاً شرح ملّا علم نحو کی کتاب ہے اور ہمارے مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ مگر منطق کی اصطلاحات اور منطقی طرز بحث کو جانے بغیر اس کتاب کو سمجھنا ممکن نہیں۔ یہی حال فنون اسلامی کی دوسری کتابوں کا ہے۔ اس طرح منطق اسلامی علوم کی فنی تدوین میں داخل ہوئی اور بالآخر وہ اسلامی کتب خانہ کا ایک مستقل جزء بن گئی۔ اب غیر ضروری طور پر یہ سوال سامنے آگیا کہ قدیم منطق کو چھوڑنا ہے تو اسلام کی قدیم فنی کتب کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج درس نظامیہ میں معقولات کا عنصر اتنا چھا گیا ہے کہ خود اسلامی علوم اس کے نیچے دب کر رہ گیے ہیں۔

تجربات کے درمیان

زندگی کے تجربات کے درمیان آدمی کی جنت یا جہنم کا فیصلہ ہوتا ہے۔ زندگی کا ہر تجربہ آدمی کو ایسے نازک مقام پر کھڑا کر دیتا ہے جس کے ایک طرف خدا کی ناراضی ہے اور دوسری طرف خدا کی رضامندی۔ ایک طرف جھک کر وہ خدا سے دور ہو جاتا ہے اور دوسری طرف جھک کر خدا کی قربت حاصل کرتا ہے۔ زندگی ایک مسلسل امتحان ہے۔ ہر آدمی مسلسل اس نزاکت میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ یا تو حق پرستی کا ثبوت دے کر خدا کی عنایات حاصل کرے یا حق کے خلاف رویہ اختیار کر کے خدا کی رحمتوں سے دور ہو جائے۔

دنیا میں جو کچھ کسی کے ساتھ گزرتا ہے، خواہ وہ دکھ ہو یا سکھ، عزت ہو یا ذلت، سب آزمائش کے لیے ہوتا ہے۔ یہ سب امتحان کے پرچے ہیں۔ ہمارا خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کن حالات میں اس کے بندے نے کس قسم کا جواب پیش کیا۔ تاہم ایسے مواقع پر آدمی تنہا نہیں ہوتا۔ اس کا خدا اس کے پاس ہی کھڑا ہوتا ہے۔ اگر آدمی آزمائش کے موقع پر خدا کی طرف لپکے تو وہ فوراً اس کو سہارا دے کر اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ موقع کے لحاظ سے صحیح ترین جواب پیش کرے۔ اور اگر آدمی آزمائش کے موقع پر خدا کو بھول جائے تو خدا بھی اس کو بھول جاتا ہے۔ وہ اس کو تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ اور جو اس کائنات میں تنہا ہو جائے اس کا ساتھی شیطان کے سوا اور کوئی نہیں۔

جب دکھ کا موقع سامنے آئے تو مومن کو صبر کا جواب پیش کرنا ہے نہ کہ بے صبری کا۔ دنیا کا ساز و سامان اس کو کم ملے تو اس کو اپنے رب کی خدمت میں شکر کے احساسات بھیجنا ہیں نہ کہ ناشکری کے احساسات۔ کسی کو کوئی عزت یا رتبہ مل جائے تو اس کو تواضع میں ڈھل جاتا ہے نہ کہ وہ گھمنڈ کرنے لگے۔ کسی کے لیے خدا دولت کے دہانے کھول دے تو اس کو اپنی یہ تصویر پیش کرنی ہے کہ وہ حقوق کی ادائیگی اور دین کی خدمت میں سب کچھ دے کر خالی ہاتھ ہو جانے والا آدمی ہے نہ کہ گن گن کر ان کا ڈھیر لگانے والا۔ غرض آزمائشوں میں پورا اترنے والا بندہ وہ ہے جس کا حال یہ ہو کہ دنیا کا ہر تجربہ اس کے اندر خدا پرستی کی نفسیات جگائے۔ زندگی کا

ہر واقعہ اس کو خدا سے قریب کرنے والا ثابت ہو۔

اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جو زندگی کے معرکوں میں صبر اور شکر کا جواب نہ پیش کر سکیں۔ زندگی کے تجربات میں پڑنا ان کے لیے خدا سے دور کرنے کا سبب بن جائے۔ ایک شخص مسلمان ہے اور ایمانی جذبہ کے تحت زندگی کے میدان میں داخل ہوتا ہے۔ مگر جب دنیا کے فتنوں میں سے کوئی فتنہ پیش آتا ہے تو وہ اس کو اپنی طرف بہالے جاتا ہے۔ دنیا کی چیزوں میں کمی ہوتی ہے تو وہ مایوس ہو کر طرح طرح کے شک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ عزت و مرتبہ کا کوئی دروازہ کھلتا ہے تو اس کی کشش اس کو جاہ پسند بنا دیتی ہے۔ وہ اپنی تمام دوڑ دھوپ کو انھیں سمتوں میں موڑ دیتا ہے جو اس کے مقام کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے والی ہوں۔ کسی کو دولت کا کوئی حصہ ہاتھ آجاتا ہے تو اس کی چمک دمک اس کو مبہوت کر دیتی ہے اور وہ دولت کمانے کی راہوں میں اس طرح گم ہو جاتا ہے گویا وہی اس کا دین و ایمان ہے۔

کامیابی کا راز

قال عبد اللّٰہ بن جعفر یوصی ابنتہ عند زواجہا: یا بنیۃ، ایاک والغیرۃ فانہا مفتاح الطلاق۔ وایاک والمعاتبۃ فانہا تورث الضغینۃ۔

حضرت عبداللہ بن جعفر نے نکاح کے وقت اپنی لڑکی کو نصیحت کی۔ انھوں نے کہا کہ اے میری بیٹی، تم غیرت اور نخوت سے بچو، کیونکہ وہ طلاق کا دروازہ کھولنے والی چیز ہے۔ اور تم غصہ اور ناراضگی سے بچو، کیوں کہ اس سے کینہ پیدا ہوتا ہے۔

یہ بہترین نصیحت ہے جو ایک باپ اپنی بیٹی کو شادی کے وقت کر سکتا ہے۔ شادی کے بعد لڑکی ایک غیر شخص کے گھر جاتی ہے۔ اس سے پہلے وہ خونی رشتہ داروں کے درمیان رہ رہی تھی۔ اب وہ ایسے لوگوں کے درمیان جاتی ہے جن سے اس کا خون کا کوئی رشتہ نہیں۔ خونی رشتہ دار (باپ، ماں، بھائی، بہن) لڑکی کی ہر بات کو برداشت کرتے ہیں۔ وہ اپنے میکے میں نخوت دکھا کر بھی بے قدر نہیں ہوتی۔ وہ غصہ دکھائے تب بھی لوگ اس سے بیزار نہیں ہوتے۔ مگر سسرال کا معاملہ اس سے سراسر مختلف ہوتا ہے۔

سسرال میں لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے وہ پیدائشی نرمی نہیں ہوتی جو میکے کے لوگوں میں ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سسرال میں اس کا ہر عمل ایک ردعمل پیدا کرتا ہے۔ میکہ میں لوگ اس کی نخوت کو نظر انداز کر دیتے تھے، مگر سسرال میں اس کی نخوت کو لوگ اپنی یادوں میں رکھ لیتے ہیں۔ میکہ میں لوگ اس کے غصہ کو بھلا دیتے تھے، مگر سسرال میں کوئی شخص اس کے غصہ کو بھلانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

ایسی حالت میں سسرال میں نباہ کی واحد شرط یہ ہے کہ لڑکی اپنے مزاج کو نئے ماحول کے مطابق بنا کر رہے۔ وہ ایسے عمل سے بچے جو ناموافق ردعمل پیدا کرنے والا ہو۔ کوئی بات اپنی پسند کے خلاف ہو تو اس کو گوارا کرے۔ کسی بات سے اس کے دل کو رنج پہنچے تو اس کو دل ہی دل میں ختم کر دے۔ کسی سے امید کے خلاف سلوک کا تجربہ ہو تو اس کی اچھی توجیہہ کر کے اس کو دماغ

سے نکال دے۔ ایک لڑکی کے لیے سسرال میں کامیاب زندگی بنانے کی یہی واحد تدبیر ہے۔ اس کے سوا سسرال کے مسئلہ کا کوئی دوسرا حل نہیں۔

آج کا باپ اپنی بیٹی کو یہ سبق دیتا ہے کہ سسرال میں اکڑ کر رہنا ورنہ لوگ تم کو دبا لیں گے۔ اس کے برعکس پہلے زمانہ کے باپ اپنی بیٹی کو یہ تعلیم دیتے تھے کہ سسرال میں دب کر رہنا ورنہ لوگ تم سے اکڑیں گے۔ انہیں دو فقروں میں ماضی اور حال کے فرق کی پوری کہانی چھپی ہوئی ہے۔

سبق آموز

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں کوئی شخص مجھ سے زیادہ حدیثیں بیان کرنے والا نہیں، سوا عبداللہ بن عمرو بن العاص کے، کیوں کہ وہ آپ سے سن کر حدیثوں کو لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا (مامن اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احد اکثر حدیثا عنہ منی الا ما کان من عبد اللہ بن عمرو بن العاص فانہ کان یکتب ولا اکتب)

بظاہر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایتوں کی تعداد حضرت ابوہریرہ کی روایتوں سے زیادہ ہو، مگر عملاً ایسا نہیں ہے۔ کیوں کہ حضرت ابوہریرہ کی روایتوں کی تعداد ۵۳۷۴ تک شمار کی گئی ہے۔ جب کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایتوں کی تعداد صرف ۷۰۰ ہے۔ یہاں ایک شخص الجھن میں پڑے گا کہ ایسا کیوں ہے۔ حالاں کہ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ یہ صورت حال ہجرت کے ابتدائی زمانہ تک تھی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص کو ان کی فوجی صلاحیت کی بنا پر اسلامی فوج کا سردار بنا دیا گیا۔ اب ان کا زیادہ وقت مدینہ سے باہر گزرنے لگا۔ حضرت ابوہریرہ حسب سابق بیشتر اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہتے اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص زیادہ تر باہر ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتداءً اگر حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایتوں کی تعداد زیادہ تھی تو بعد کو حضرت ابوہریرہ کی روایتوں کی تعداد زیادہ ہوگئی۔

اسی طرح اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک معاملہ کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ جو بات معاملہ کے ایک رخ کے پہلو سے کہی گئی ہو اس کو معاملہ کے دوسرے پہلو پر چسپاں کر دیا جائے تو بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے اور معاملہ کی صحیح تصویر آدمی کے سامنے نہیں آتی۔

ایک آیت

قرآن میں اہل نفاق کی ایک خصوصیت یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کا معاملہ کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے: اور لوگوں میں کچھ لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر، حالاں کہ وہ بالکل ایمان والے نہیں ہیں۔ وہ فریب دیتے ہیں اللہ کو اور ایمان والوں کو۔ اور وہ اپنے آپ کے سوا کسی کو فریب نہیں دیتے۔ لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔ (ومن الناس من یقول آمنا باللہ وبالیوم الآخر وماھم بمؤمنین۔ یخادعون اللہ والذین آمنوا وما یخدعون إلا أنفسھم وما یشعرون، بقرہ ۸-۹) اس آیت کی تفسیر ایک حدیث سے ہوتی ہے جس کو قرطبی نے اپنی تفسیر میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تخادع اللہ فانہ من یخادع اللہ یخدعہ اللہ، ونفسہ یخدع لو یشعر قالوا یا رسول اللہ وکیف یخادع اللہ قال تعمل بما امرک اللہ بہ وتطلب بہ غیرہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اللہ کو دھوکا نہ دو کیوں کہ جو اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ اس کو دھوکا دیتا ہے۔ اور وہ شخص خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے اگر وہ جانے۔ لوگوں نے کہا اے خدا کے رسول، کوئی شخص خدا کو کیسے دھوکا دیتا ہے۔ فرمایا: تم وہ عمل کرو جس کو کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے اور اس کے ذریعہ خدا کے سوا کسی اور چیز کی طلب رکھو۔

ایک آدمی بظاہر اسلامی کام اور دینی عمل میں مشغول نظر آتا ہے۔ مگر اس اسلامی کام اور اس دینی عمل میں وہ اس لیے مشغول ہے کہ اس کے ذریعہ اس کو شہرت وعزت حاصل ہوتی ہے۔ ایسا شخص گویا خدا کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیوں کہ اس کا اصل مقصود تو دنیوی منافع ہیں مگر بظاہر وہ اپنے آپ کو دین کے خادم اور اسلام کے مجاہد کے روپ میں پیش کر رہا ہے۔

ایک اعتراف

۱۹۷۶ میں لندن میں جشن اسلام (Festival of Islam) کے نام سے ایک تقریب منائی گئی تھی۔ اس موقع پر لندن کے مشہور اخبار ٹائمس (۲ اپریل ۱۹۷۶) نے اپنا ایک خصوصی نمبر شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا اسلامی دنیا (The World of Islam)

ٹائمس کی اس خصوصی اشاعت میں ولفرڈ بلنٹ (Wilfred Blunt) کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس مقالہ میں موصوف نے لکھا تھا کہ انسان کی پوری لمبی تاریخ میں شاید اس سے زیادہ اچنبھے میں ڈالنے والا کوئی واقعہ نہیں ہے جیسا کہ غیر معمولی تیز رفتاری کے ساتھ اسلام کا پھیلاؤ۔ کون اندازہ کر سکتا تھا کہ درمیانی عمر کا ایک شخص جو کسی وقت مکہ کا تاجر اور تجارتی قافلہ کا سردار ہو، جس کو ۶۲۲ء میں اس کے وطن سے نکال دیا گیا ہو اور وہ مدینہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوا ہو، وہ ایک ایسے مذہب کی بنیاد رکھے گا جو اس کی موت کے ایک صدی کے اندر مہذب دنیا کے آدھے حصہ میں قائم ہو جائے گا۔ جو مغرب میں فرانس کے قلب تک پہونچ جائے گا اور مشرق میں وہ دریائے سندھ کو عبور کر کے چین کی سرحد تک جا پہونچے گا۔

ولفریڈ بلنٹ مزید لکھتے ہیں کہ فرض کرو کہ اسلام کا یہ سیلاب نہ آتا تو کیا ہوتا۔ مغرب میں سائنس کی ترقی کی تاخیر کی سب سے بڑی وجہ رومی ہندسہ کا بے ڈھنگا پن تھا۔ عربی ہندسہ جو آٹھویں صدی عیسوی کے آخر میں ہندستان سے بغداد پہونچ چکا تھا، اگر وہ جلد ہی مغربی یورپ پہونچتا اور مجموعی طور پر اختیار کر لیا جاتا تو وہ بہت سی سائنسی ترقی جس کو ہم اٹلی کی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ منسوب کرتے ہیں، وہ کئی سو سال پہلے حاصل ہو جاتیں۔

ولفرڈ بلنٹ (۱۹۲۲ - ۱۸۴۰) اسلامی تہذیب سے بہت متاثر تھا۔ اس کی ایک کتاب کا نام ہے اسلام کا مستقبل (*The Future of Islam*) یہ کتاب پہلی بار ۱۸۸۲ میں شائع ہوئی تھی۔ اس نے کئی مسلم ملکوں کا دورہ بھی کیا تھا۔ اگلے صفحے پر اس کے اصل الفاظ نقل کیے جاتے ہیں۔

Most Amazing Event

Islam is one of the great religions of the world — numerically second only to Christianity. Iranis no more than a small corner of that vast territory, stretching from the Atlantic to the South China Sea, where the Muezzin's voice is still to be heard, though today often recorded, calling the faithful to prayer.

There is, perhaps, nothing more amazing in the whole long history of mankind that the extent and the rapidity of the dissemination of Islam. Who could possibly have foreseen that a middle-aged one-time Meccan tradesman and caravan leader, driven in the year 622 from his birth-place to take refuge in Yathrib (Medina), was to found a religion which within a century of his death would have established itself over half the civilized world, would have struck westwards into the heart of France and eastwards crossed the Indus and penetrated to the frontiers of China.

And supposing the tide of Islam had not been stemmed? Nothing so delayed the advance of science in the West as the clumsiness of the Roman numerals. Had the Arabic numerals, which had reached Baghdad from India towards the end of the eighth century, been soon afterwards introduced into and adopted by western Europe as a whole, much of that scientific progress which we associate with the Renaissance in Italy might have been achieved several centuries earlier.

by Wilfrid Blunt, *The Times* (London) April 2, 1976

سوئزرلینڈ کا سفر

دوسری قسط

جنیوا کی کانفرنس (۷-۹ دسمبر ۱۹۸۶) کے موقع پر میں نے جو انگریزی مقالہ پیش کیا، منتظمین کی طرف سے اس کی فوٹو کاپی کر کے تمام لوگوں کے درمیان اس کو تقسیم کیا گیا۔ اس مقالہ کا عنوان تھا :

Religious Liberty in Islam

یہ تقریباً آدھ گھنٹہ کا مقالہ تھا۔ اس میں میں نے قرآن اور حدیث اور اسلامی تاریخ کے حوالوں سے دکھایا کہ اسلام اگرچہ اس کا قائل نہیں کہ سچائی کئی ہے یا کئی ہو سکتی ہے۔ اسلام کے نزدیک سچائی صرف ایک ہے۔ اس کے باوجود اسلام اس کا قائل نہیں کہ سچائی کو منوانے کے لیے جبر کیا جائے۔ سچائی کو بزور منوانا سچائی کی توہین ہے۔ اس دنیا میں لین دین کا اصول رائج ہے۔ اس لیے اگر ہم اپنے لیے فکر کی آزادی چاہتے ہوں تو ہمیں دوسروں کو بھی فکر کی آزادی دینی ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ سچائی وہ ہے جو آدمی کو بطور دریافت ملے اور دریافت کے طور پر سچائی کسی آدمی کو اسی وقت ملتی ہے جب کہ وہ آزادانہ طور پر سوچے اور آزادانہ طور پر ایک نتیجہ تک پہونچے۔

مزید میں نے تاریخی حوالوں سے بتایا کہ اسلام ساتویں صدی میں آیا جب کہ عام طور پر ساری دنیا میں مذہبی جبر کا رواج تھا۔ مگر اسلام نے زمانی رواج کے سراسر خلاف مذہبی آزادی کا اعلان کیا۔ اس سلسلہ میں میں نے مختلف تاریخی حوالے نقل کیے۔ مثلاً ایک مستشرق نے لکھا ہے کہ اسلام نے اپنے اقتدار کے زمانہ میں اپنے ماتحت غیر مسلموں کو اپنے مذہب کی مکمل آزادی دی۔ یہ بات ساتویں صدی کی تاریخ میں انتہائی انوکھی تھی :

They were allowed the free and undisturbed exercise of their religion — so striking in the history of the seventh century.

اس کانفرنس میں ہر مذہب کے لوگ شریک تھے۔ تاہم عیسائی حضرات کی تعداد زیادہ تھی جو امریکی اور یورپی علاقوں سے آئے تھے۔ یہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ متعدد لوگ بڑے بڑے

اداروں کے ذمہ دارانہ مناصب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے اکثر کے ساتھ ذاتی ملاقاتیں رہیں۔ یہ ذاتی ملاقاتیں زیادہ تر کھانے اور ناشتہ کی میز پر ہوتی تھیں۔ ان کی اکثریت کا یہ حال تھا کہ جب وہ میرے بارہ میں معلوم کرتے کہ میں "اسلامک سنٹر" کا صدر ہوں تو وہ غیر معمولی دل چسپی کے ساتھ اسلام کے بارہ میں باتیں کرنے لگتے۔ بیشتر لوگوں نے اس تاثر کا اظہار کیا کہ ہم اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اسلام کے بارہ میں ہم کو اپنی زبان میں کتابیں نہیں ملتیں۔

ڈاکٹر گوریری (Dr Claudio J. Guerrieri) ارجنٹینا سے آئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے حال میں عالمی مذاہب پر ۲۰۰ کتابیں منگائی ہیں مگر ان میں ایک لفظ بھی اسلام پر نہیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ اسلام کے بارہ میں اس بلیک آوٹ کا کون ذمہ دار ہے۔

اس کانفرنس میں میں تنہا مسلمان تھا جو کسی ملک سے اسلام کے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ اسی طرح شرکار کانفرنس میں ایک ہندو تھے۔ ان کا نام ڈاکٹر موہن کانت گوتم تھا۔ ان کی پیدائش ہندستان (کاس گنج) میں ہوئی۔ مگر پچھلے ۲۰ سال سے وہ باہر رہتے ہیں۔ آج کل وہ ندرلینڈ میں ساوتھ ایشین اسٹڈیز کے ڈائرکٹر ہیں۔ انھوں نے مجھ سے گفتگو کے دوران کہا کہ اگرچہ میں ایک ہندو ہوں۔ مگر مجھے اسلام کے مطالعہ سے بہت دل چسپی ہے۔ انھوں نے اسلام پر چند کتابیں پڑھی ہیں۔ میں نے انھیں اسلامی مرکز کی چند مطبوعات پیش کیں۔ بدھزم کے نمائندہ پھنتسوگ ونگیال (لندن) تھے۔ ان کو بھی انگریزی مطبوعات دی گئیں۔

مسز سوسن ٹیلر (Dr Susan Taylor) ایک تعلیم یافتہ معمر خاتون تھیں۔ وہ امریکہ (واشنگٹن ڈی سی) سے آئی تھیں۔ وہ اگرچہ ایک عیسائی مذہبی ادارہ کی عہدیدار ہیں۔ تاہم انھوں نے اسلام کے مطالعہ کے لیے اپنی گہری دل چسپی کا اظہار کیا۔ انھوں نے بھی یہی شکایت کی کہ اسلام پر مطالعہ کے لیے انگریزی میں کتابیں نہیں ملتیں۔ ان کو بھی اسلامی مرکز کی چند انگریزی مطبوعات پیش کی گئیں۔

اگلے صفحہ پر کانفرنس کے پروگرام میں باضابطہ طور پر حصہ لینے والوں کی فہرست کا عکس دیا جارہا ہے۔ یہ فہرست خود کانفرنس کی طرف سے شائع کر کے تقسیم کی گئی تھی۔ اس فہرست میں ڈاکٹر جوزف بیج کا نام اٹھارویں نمبر پر ہے، حالاں کہ وہ ڈبلوسی آر ایل کے صدر ہیں جس کی طرف سے یہ کانفرنس کی گئی تھی۔ ہندستان جیسے ملکوں میں اس قسم کی ترتیب ناممکن ہے۔

WORLD COUNCIL ON RELIGIOUS LIBERTY (WCRL)

HOTEL INTERCONTINENTAL GENEVE
Geneva, Switzerland
December 7-9, 1986

PROGRAM PARTICIPANTS

Ms. Berdina Auma: Director of Public Affairs, All Africa Conference of Churches, Nairobi, Kenya

Mr. Adepoju Akomolafe: Vice President, Christian Council of Nigeria, Logos, Nigeria

Dr. Petro Bilaniuk: Professor, Faculty of Theology, University of St. Michael's College, Toronto, Ontario; and Honorary Canon of the Ukranian Catholic Church

Rabbi Daniel Cohan-Sherbok: Professor, Faculty of Humanities, University of Kent, Canterbury, England

Msgr. Freddie Delgado: Member and Former Coordinator of the Human Rights Commission of El Salvador and Former Secretary of the Episcopal Conference, 1973-82, El Salvador

Dr. Frances Dessart: Pasteur, Professor, Director, Eglise Evangelique International, Nanur, Belgium

Rev. Oka Fau'olo: General Secretary, Samoa Council of Churches, Aspia, Western Samoa

Rev. Kenneth M.J. Fernando: Director, Ecumenical Institute for Study and Dialogue, Colombo, Sri Lanka

Mr. Vincent Foote: Director Baptist Laity, Greensboro, NC

Dr. Claudio J. Guerrieri: Plastic Surgeon and Religious Activist, Buenos Aires, Argentina

Bro. Andrew Gonzalez: President, De La Salle University, Manila, Phillipnes

Dr. Mark N. Gretason: Dean, Central School of Religion, Worcester, United Kingdom

Honorable Horst Keilau: Chief, Prevention of Discrimination Branch, Center for Human Rights, Geneva, Switzerland

Dr. Wahiduddin Khan: President, The Islamic Center, New Delhi, India

Dr. Oscar McLaughlin: Pastor St. Francis AME Zion Church, Port Chester, New York (USA): Member Board of Trustees, Shaw Divinity School, Raleigh, N.C. (USA)

Dr. L.M. Msibi: Founding Director, Ma-African House, Johannesburg, South Africa

Honorable Robert G. Mueller: Assistant Secretary General, United Nations, New York, N.Y.

Dr. Joseph C. Paige: President, WCRL; Executive Vice President, Shaw Divinity School, Raleigh, North Carolina (USA)

Dr. Gioufranco Rossi: Secretary General, International Association for the Defense of Religious Liberty, Bern, Switzerland

r. Don Sills: President, Coalition for Religious Freedom, Washington, D.C.

. Christian J.G. Vonck: Professor and Executive Director, Faculty of Comparative Religion, Antwerpen, Belgium

. Phuntsog Wangyal: Representative of Dalai Lama, London, United Kingdom

Auguste-Raynold Werner: Accredited Representative to the United Nations for International Association for Religious Fredom (IARF) and International Progress Organization (IPO), Geneva

تنظیم (WCRL) کے صدر ڈاکٹر جوزف بیچ نے بتایا کہ پچھلے ایک سال (ستمبر ۱۹۸۵) سے ہم اس مشن کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ہم نے اس دوران میں بہت کچھ کہا ہے اور شائع کیا ہے۔ مگر ہم کو سب سے زیادہ خط اور تار اور ٹیلی فون جس چیز پر ملے وہ صرف ایک چھوٹا سا جملہ تھا۔ یہ جملہ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا :

Atheistic communism is the number one enemy of religious liberty.

(بے خدا اشتراکیت مذہبی آزادی کی دشمن نمبر ایک ہے) یہ نفسیات تمام قوموں میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے، اور خود مسلمانوں میں بھی۔ کسی دشمن کے خطرہ کی گھنٹی بجائیے تو سب سے زیادہ بھیڑ آپ کے گرد جمع ہو جائے گی۔ اور جس پیغام میں اس قسم کے خارجی خطرے کی گھنٹی نہ بجائی جائے، اس کو ہمیشہ بہت کم مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی لیڈر کی مقبولیت کا پیمانہ وہ بھیڑ نہیں ہے جو مذہبی خطرہ یا قومی خطرہ کا الارم بجا کر جمع کی گئی ہو، اس کا پیمانہ صرف وہ مجمع ہے جو مثبت پیغام کے نتیجہ میں اس کے گرد جمع ہوا ہو۔ بار بار یہ منظر سامنے آیا ہے کہ "خطرہ" کی نفسیات کو جگانے کے نتیجہ میں ایک لیڈر کے گرد بھیڑ جمع ہوئی۔ مگر جیسے ہی اس نے انھیں کوئی ایسا پیغام دینا چاہا جس میں خود اپنے آپ کو بدلنے کا تقاضا ہو تو تمام بھیڑ اس طرح منتشر ہو جائے گی جیسے وہ کبھی جمع ہی نہیں ہوئی تھی۔

ایک امریکی مقرر ڈاکٹر ڈونال سِل (Dr Donal Sills) نے کہا کہ امریکہ کے چرچ اس وقت تجارت کا ذریعہ (American churches are a source of business) ہیں۔ یہی بات نائجیریا کے اینگلیکن چرچ کے ایک ذمہ دار آرکومولا (Adepoju Akomolafe) نے بھی کہی۔ امریکہ کے مسیحی چرچ کے بارہ میں خود مسیحی مقررین کی زبان سے یہ بات سن کر تھوڑی دیر کے لیے مجھے تعجب ہوا۔ مگر پھر میں نے یہ سوچا کہ یہ تو وہی بات ہے جو آج تمام مذاہب کے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ خود مسلمانوں کے لیے بھی اب ان کا دین ایک تجارت بن گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ کسی کی تجارت یہ ہے کہ وہ دین کے نام پر پیسہ حاصل کرے اور کسی کی تجارت یہ ہے کہ وہ دین کے نام پر شہرت اور قیادت کے مقام پر پہونچے۔

ارباب عہدہ سے ذاتی طور پر ملاقات کرنے میں مجھے ہمیشہ تکلف ہوتا ہے۔ اس بنا پر میں ڈاکٹر پیج (Dr Joseph Paige) سے ذاتی ملاقات نہ کر سکا تھا۔ ایک موقع پر انھوں نے خود اس کی صورت پیدا کر دی۔ وہ اچانک اٹھ کر آئے اور میرے پاس خالی کرسی پر بیٹھ گیے۔ انھوں نے میرے ساتھ کئی تصویریں کھنچوائیں۔ اس دوران ان سے گفتگو ہوئی۔ میں نے ان کے سامنے کانفرنس کے زیر بحث موضوع پر اسلام کا تصور پیش کیا۔ اور انھیں انگریزی الرسالہ کے دو شمارے دیئے۔ اگلے دن میں نے دیکھا کہ وہ الرسالہ (انگریزی) ایک صاحب کو دکھا رہے ہیں۔ وہ اس کو اہتمام کے ساتھ اپنی فائل میں رکھے ہوئے تھے۔

اجتماعی مواقع پر ایک مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اگر مقرر کی زبان اور سامعین کی زبان ایک دوسرے سے مختلف ہو تو تقریر کو سامعین کے لیے کس طرح قابل فہم بنایا جائے۔ پہلے زمانہ میں اس کا طریقہ یہ تھا کہ مقرر کے ساتھ ایک اور آدمی بطور ترجمان کھڑا ہو اور وہ مقرر کی تقریر کو سامعین کی زبان میں بیان کرے۔ اس کے بعد ان آلات کا زمانہ آیا جن کو عام طور پر ہڈسٹ (Head set) کہا جاتا ہے۔ اس میں تار کے ذریعہ مقرر کے الفاظ ترجمان تک پہونچائے جاتے تھے۔ اور دوبارہ تار کے ذریعہ ترجمان کی آواز سامعین تک پہونچتی تھی۔

اب الکٹرانکس کے دور میں مزید ترقی یافتہ طریقے وجود میں آگیے ہیں۔ اب ایسے ہڈسٹ بنائے گیے ہیں جن کے لیے تار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تار کے بغیر کام کرتے ہیں۔ اعلیٰ معیار کی کانفرنسوں میں اب یہی ہڈسٹ استعمال ہوتے ہیں۔ جنیوا کی کانفرنس میں بھی اسی کا انتظام تھا۔ مثلاً مقرر اگر فرانسیسی یا اسپینی زبان میں بول رہا ہو تب بھی عین اسی وقت چھوٹے سے ہڈسٹ کے ذریعہ اس کو انگریزی میں سنا جا سکتا تھا۔ سامع کی نسبت سے مقرر کے الفاظ ناقابل فہم بولی کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر ہڈسٹ کے استعمال سے وہ سننے والوں کے لیے قابل فہم بن جاتے تھے۔

اس قسم کی چیزیں آج عام ہو چکی ہیں۔ لوگ ان کو "سائنس کا معجزہ" کہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ خدا کا معجزہ ہے۔ میرا یہ حال ہے کہ میں جب اس قسم کی کسی سائنسی چیز کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ قرآن کی آیت (واعطاکم من کلّ ما سألتموہ) کی تفسیر ہے۔ وہ براہ راست خداوند عالم کا عطیہ ہے نہ کہ حقیقۃً انسانی سائنس کا عطیہ۔

مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کی طرف سے اکثر یہ الفاظ سننے پڑتے ہیں کہ تمہارے یہاں تو ستر سے زیادہ فرقے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دوسرے مذاہب میں اس سے بھی زیادہ فرقے ہیں۔ امریکہ کے ونسنٹ فوٹ (Vincent Foote) ایک بپٹسٹ (Baptist) تھے۔ انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں ۲۵۰ قسم کے بپٹسٹ ہیں۔ اور مجموعی طور پر عیسائیوں میں تین ہزار فرقے ہیں۔ ابھی حال میں (۳۵ سال پہلے) ایک نیا عیسائی فرقہ بنا ہے۔ اس کا صدر دفتر امریکہ (واشنگٹن ڈی سی) میں ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

Church of Scientology International

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں اور دوسرے مذاہب میں اصل فرق فرقے کی کثرت کا نہیں ہے بلکہ جھگڑے کی کثرت کا ہے۔ مسلمان بات بات پر آپس میں لڑتے رہتے ہیں اس لیے کم فرقہ ہونے کے باوجود وہ کثرت فرقہ کے لیے مشہور ہیں۔ جب کہ دوسرے مذاہب کے لوگ زیادہ فرقے ہونے کے باوجود اس طرح آپس میں نہیں لڑتے، اس لیے ان کا باہمی اختلاف دوسروں کو بہت کم دکھائی دیتا ہے۔

کناڈا کے ایک پادری (Petro Bilaniuk) نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اشتراکی روس میں کس طرح مذہبی تشدد ہو رہا ہے۔ انھوں نے اعداد و شمار کی روشنی میں کافی تفصیلات بتائیں۔ مگر یہ تمام تفصیلات صرف عیسائی مذہب اور عیسائی فرقہ پر تشدد کے بارہ میں تھیں۔ ان کی تقریر کے مطابق گویا اشتراکی روس میں مسلمانوں کا کوئی وجود نہیں اور نہ ان پر کوئی تشدد ہوا ہے۔

بظاہر یہ یک رخا جائزہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر ٹھیک یہی طریقہ خود مسلمان بھی اختیار کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی کتابیں اور مضامین اشتراکی روس کے بارہ میں پڑھیے تو ان میں عام طور پر صرف اس تشدد کا ذکر ملے گا جو اشتراکی انقلاب کے بعد وہاں کے مسلم فرقہ پر ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی نظر میں اصل مسئلہ اپنی قوم کا ہے نہ کہ انسانی اصول کا۔ انھیں حقیقۃً قومی شکایت ہے نہ کہ اصولی شکایت۔

ڈاکٹر لیک (Dr Daniel Lack) نے کہا:

Religious rights are less fundamental than the other rights, like economic rights.

(مذہبی حقوق دوسرے حقوق سے کم بنیادی ہیں، مثلاً معاشی حقوق سے) یہ سن کر مجھے ایک لمحہ کے لیے

جھٹکا لگا۔ میں نے سوچا کہ جدید انسان اگر مذہب کو مانتا بھی ہے تو اس کو کم درجہ دینے کے بعد مانتا ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ عملی طور پر مسلمانوں کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں۔ مسلمانوں کی بڑی بڑی سرگرمیوں کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے یہاں بھی دین دوسرے درجہ پر چلا گیا ہے۔ اور دوسری دوسری چیزوں نے نمبر ایک کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ حتیٰ کہ بہت سی تحریکیں جو بظاہر دین کے نام پر اٹھیں ان کی تہ میں بھی حقیقتہً سیاسی اور معاشی اور قومی محرک زیادہ کام کرتا ہوا ملے گا اور دینی محرک کم۔

اس طرح کی کانفرنسوں میں عمدہ الفاظ بولنے والے تو بہت ملتے ہیں۔ مگر ایسا کوئی شخص شاذونادر ہی نظر آتا ہے جو واقعتہً درد اور فکر کا حامل ہو۔ ایک صاحب کے چہرے پر دردمندی کے آثار دیکھ کر مجھے ان سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ان کا نام پھنسوگ ونگیال (Phuntsog Wangyal) تھا۔ مگر ان سے گفتگو کے بعد میرا حسن ظن باقی نہ رہ سکا۔ وہ بدھسٹ تھے اور سرے سے خدا کو مانتے نہ تھے۔ ان کی دردمندی کا راز یہ تھا کہ وہ تبتی ہیں۔ تبت میں چین میں داخلہ کے بعد انھیں تبت چھوڑنا پڑا۔ آج کل وہ لندن میں رہتے ہیں۔ وہ برطانی شہریت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر اب تک انھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ وہ اپنے آپ کو صرف ایک "رفیوجی" سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ ساری دنیا میں کہیں ان کا کوئی وطن نہیں۔ ان کا درد "رفیوجی" ہونے کے احساس پر مبنی تھا نہ کہ اللہ کے سامنے جواب دہی کے احساس پر۔

مسٹر ونگیال سے میں نے پوچھا: آپ لوگ کیا دلائی لاما کو خدا یا خدا کا اوتار (God-incarnate) سمجھتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ عام طور پر بدھوں کا یہی خیال ہے۔ وہ ان کو زندہ بدھا (Living Buddha) مانتے ہیں۔ مگر میں ایسا خیال نہیں کرتا۔ میرے نزدیک وہ ایک اچھے انسان ہیں اور بس۔ مسٹر ونگیال کے اس جواب کے بعد میں نے سوچا کہ دوسرے مذاہب میں بگاڑ کی وجہ سے ایسے عقیدے شامل ہو گئے ہیں جن کو جاہل عوام تو مان سکتے ہیں، مگر ان کا کوئی شخص جب اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا ہے تو وہ اپنے علمی ذہن کے ساتھ ان عقائد کی موافقت نہیں پاتا، اس لیے وہ ان کو "معتدل" بنا کر مانتا ہے۔ مگر اسلام چوں کہ ہر قسم کی تبدیلی سے پاک ہے۔ اس لیے اسلام کا ماننے والا جب اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا ہے تو اس کو یہ ضرورت نہیں ہوتی کہ اپنے دینی عقائد کو

"معتدل" بنائے۔ اس کا علم اور اس کا عقیدہ دونوں اسے یکساں سطح کی چیز معلوم ہوتے ہیں —— اسلام کو انسانی تحریفات سے محفوظ رکھ کر اللہ تعالیٰ نے انسانیت پر کتنا بڑا احسان فرمایا ہے۔

اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات اور الرسالہ (انگریزی) کے کچھ شمارے میرے ساتھ تھے۔ یہ کتابیں اور الرسالہ انگریزی کانفرنس کے اکثر شرکار کو دیے گئے۔ لوگوں نے کافی دل چسپی کے ساتھ ان کو لیا اور مزید انگریزی لٹریچر کی خواہش ظاہر کی۔

جنیوا ہوٹل میں جن اصحاب سے میری ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں ایک ممتاز شخص ڈاکٹر احمد مختار مبو تھے۔ وہ افریقی ہیں اور اقوام متحدہ کے مشہور ادارہ یونسکو کے ڈائرکٹر جنرل ہیں۔ ان کا دفتر پیرس میں ہے۔ وہ ایک اور کانفرنس کے سلسلہ میں جنیوا آئے تھے اور ہوٹل انٹر کانٹی ننٹل میں مقیم تھے:

Dr Amadou-Mahtar M'Bow, Director General UNESCO
7, Place de Fontenenoy, 75700 Paris (Tel. 45681310–45681311)

یہ نہایت سنجیدہ بزرگ تھے۔ قرآن (بغیر ترجمہ) ان کے ساتھ تھا۔ مگر وہ عربی سے واقف نہ تھے۔ اسلامیات پر بھی ان کا باقاعدہ مطالعہ نہیں ہے۔ ان کو میں نے الرسالہ (انگریزی) اور پیغمبر انقلاب (انگریزی) مطالعہ کے لیے دیا۔ اگلے دن دوبارہ ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ میں نے پیغمبر انقلاب (انگریزی) پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ بلاشبہ ایک ممتاز (Excellent) کتاب ہے۔ انھوں نے کہا کہ کتاب ختم کرنے کے بعد میں اپنے مفصل تاثرات آپ کو لکھوں گا۔

کناڈا کے ایک پروفیسر ڈاکٹر برائنٹ سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

Dr M. Darrol Bryant, University of Waterloo
5 Park Ave. W., Elmira, Ontario, Canada N3B 1K9
Phones – Home: 519–669–5321, Office: 519–884 -4400

ڈاکٹر برائنٹ کو الرسالہ انگریزی کے چند شمارے دیے گئے۔ انھوں نے ان کو پڑھ کر ان سے غیر معمولی دل چسپی کا اظہار کیا۔ میں نے الرسالہ کی انگریزی زبان کے بارے میں ان کی رائے پوچھی۔ انھوں نے کہا کہ اس کی زبان بہت اچھی اور بہت واضح ہے۔ انھوں نے کہا کہ عام طور پر ہندستانی لوگ جو انگریزی لکھتے ہیں اس کو مغربی لوگ پڑھ نہیں پاتے۔ مگر الرسالہ کو میں نے نہایت دل چسپی کے ساتھ پڑھا۔

اس کی زبان ایسی تھی کہ اس کو سمجھنے میں مجھے ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ اتنی اچھی انگریزی آپ خود لکھتے ہیں یا کوئی اور ہے جو اس کو لکھتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کو فرشتے (Angels) لکھتے ہیں۔ یہ سن کر وہ دیر تک ہنستے رہے۔

گفت گو کے دوران انھوں نے بتایا کہ امریکہ اور کناڈا میں پچھلے برسوں میں مذہب کا مطالعہ کرنے کا رجحان بڑھا ہے اور اسلام کا مطالعہ کرنے کا بھی۔ مگر وہاں کا عام باشندہ ابھی تک اسلام کے بارہ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں کا ایک عام آدمی اسلام کے نام سے صرف "خمینی" کو جانتا ہے اور خمینی کی تصویر جو امریکہ میں ہے اس کو آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ ان کی باتوں سے میں نے یہ تاثر لیا کہ اسلام کے تعارف پر اگر ایسی انگریزی کتابیں شائع کی جائیں جن کی زبان واقعی انگریزی ہو، وہ "انڈین انگلش" نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ یہ کتابیں جدید اسلوب میں تیار کی گئی ہوں تو مغرب کے لوگ ان کو نہایت شوق کے ساتھ لیں گے اور ان کا باقاعدہ مطالعہ کریں گے۔

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ عرصہ سے سوئزرلینڈ میں رہتے ہیں اور اب یہیں کی شہریت حاصل کرلی ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر شدید غم کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت مسلمانوں کی حالت حیرت ناک حد تک درد اور کرب کی کہانی بن گئی ہے۔ وہ لوگ جو اس لیے پیدا کیے گیے تھے کہ وہ زمین پر خیر امت ہوں، وہ آج آخری بربادی کے گڑھے میں پہونچ گیے ہیں۔ وہ آج اپنے دشمنوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ حتیٰ کہ آج ایک مسلمان اپنے بھائی کے مقابلے میں اپنے دشمن پر زیادہ بھروسہ کرتا ہے۔ ان کے الفاظ یہ تھے:

Those who were created to be the best nation on earth have descended to a bottomless pit, now they are subjected to their enemies to the extent that a Muslim has more trust in the enemy than in his brother.

میں نے کہا کہ مسلمانوں کا یہ انجام اس لیے ہے کہ انھوں نے مسلمان کی حیثیت سے اپنے فرض منصبی کو چھوڑ دیا ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ وہ فرض منصبی کیا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ دعوت الی اللہ ہے۔ یعنی خدا کے سچے دین کو تمام اقوام عالم تک پہونچانا۔ یہ طرز فکر ان کے لیے بالکل نیا تھا۔ اب تک ان کا ذہن یہ تھا کہ مسلمان جدید ترقیاتی شعبوں میں پچھڑ گیے ہیں اور ان شعبوں میں آگے بڑھ کر وہ اقوام عالم کے ہم سطح

ہوسکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مسلمان "خیر امت" اسی اعتبار سے ہیں کہ وہ خدا کے دین کی پیغام بری کریں۔ اس لیے ان کی ترقی اور سربلندی تمام تر اسی عمل پر موقوف ہے۔ اس عمل کو اختیار کر کے وہ "سب سے اعلیٰ" قوم بن سکتے ہیں، اور اگر وہ اس عمل کو چھوڑ دیں تو وہ سب سے بری قوم بن جائیں گے۔ اس کے بعد ان پر یرمیاہ نبی کے وہ الفاظ صادق آئیں گے جو بائبل میں اس طرح نقل کیے گیے ہیں :

Reprobate silver shall men call them, because the Lord hath rejected them (Jeremiah 6:30).

جنیوا میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ عرب رہتے ہیں۔ انھوں نے میری عربی کتاب (الاسلام یتحدیٰ) پڑھی تھی اور اس سلسلہ میں ان کا ایک خط مجھے دہلی کے پتہ پر ملا تھا۔ یہاں ان سے ملاقات کا خیال ہوا۔ مگر ان کا ٹیلی فون نمبر میرے پاس موجود نہ تھا۔ کمرہ میں رکھی ہوئی ٹیلی فون ڈائرکٹری پر نظر پڑی تو میں نے سوچا کہ شاید اس میں ان کا نام ہو۔ ڈائرکٹری دیکھنا شروع کیا تو اس میں ان کا نام موجود تھا۔ چنانچہ اس کے مطابق میں نے اپنے کمرہ سے ٹیلی فون کیا تو وہ مل گیے۔ اولاً ٹیلی فون پر گفت گو ہوئی۔ اس کے بعد وہ ہوٹل تشریف لائے تو زیادہ تفصیل کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے :

Yahya Basalamah, Grange-Levrier 2,
1220 Les Avanchets, Geneva. Tel. (022) 960625

ان کو الرسالہ (انگریزی) اور پیغمبر انقلاب (انگریزی) وغیرہ کتابیں دی گئیں۔ وہ تبلیغی جماعت سے واقف تھے۔ مگر انھیں تبلیغی جماعت پر بعض پہلوؤں سے اعتراض تھا۔ میرے پاس تبلیغی تحریک کا انگریزی ترجمہ تبلیغ موومنٹ (*Tabligh Movement*) موجود تھا، وہ میں نے انھیں دیا۔ عربی ان کی مادری زبان ہے۔ مگر وہ انگریزی زبان سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔

جناب یحییٰ باسلامہ سے یہ ملاقات ٹیلی فون کے ذریعہ ممکن ہوئی۔ ان کے علاوہ جنیوا میں مقیم کئی اور صاحبان سے ملاقات کی صورت بھی ٹیلی فون ہی کے ذریعہ پیدا ہوئی۔ ٹیلی فون بھی کیسی عجیب نعمت ہے۔ حسب ذیل تین نمبروں پر بٹن دبا کر میں ایک منٹ کے اندر دہلی سے بات کر سکتا تھا :

0091 – 11 – 611128

مگر موجودہ زمانہ میں کثرت استعمال نے اس نعمت کی حیثیت پر غفلت کا پردہ ڈال دیا ہے۔ بے شمار

لوگ رات دن ٹیلی فون استعمال کرتے ہیں مگر شاید ہی اس زمین پر وہ انسان موجود ہو جس کا یہ حال ہو کہ جب وہ ٹیلی فون کا نمبر ڈائل کرے اور دور دراز مقام کے آدمی سے اس کی اس طرح بات ہونے لگے جیسے کہ وہ اس کے بالکل قریب موجود ہے تو احساس نعمت سے اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ انسان سے ربط قائم کرتے ہوئے اس کی روح خدا سے مربوط ہو جائے۔

جنیوا کی ملاقاتوں میں سے ایک یادگار ملاقات ڈاکٹر عبدالحکیم طبیبی کی تھی۔ وہ ایک افغانی ہیں۔ افغانستان میں روس کے داخلے سے پہلے وہ وہاں اعلیٰ سرکاری عہدہ پر تھے۔ وہ افغانستان کی طرف سے تقریباً دس ملکوں میں سفیر رہ چکے ہیں۔ آخر وقت میں وہ اقوام متحدہ میں افغانستان کے نمائندہ تھے اور نیویارک میں مقیم تھے۔ افغانستان میں جب انقلاب آیا اور روسی فوجیں وہاں داخل ہو گئیں تو ۱۹۷۷ میں انھوں نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا اور جنیوا چلے آئے۔ یہاں انھوں نے ایک کافی بڑا ادارہ قائم کیا ہے۔ وہ افغانستان کی تحریک مجاہدین کے ممتاز نمائندوں میں سے ہیں اور جنیوا سے ایک ماہانہ مجلہ نکالتے ہیں جس کا نام جمال الدین افغانی کے قدیم مجلہ کے نام پر "العروۃ الوثقیٰ" رکھا گیا ہے۔ سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ - ۱۸۹۲) نے ۱۸۸۴ میں پیرس سے ایک عربی ماہنامہ العروۃ الوثقیٰ کے نام سے نکالا تھا۔ مگر چند شماروں کے بعد وہ بند ہو گیا۔ اب ڈاکٹر طبیبی اسی نام سے عربی اور انگریزی میں ایک ماہنامہ جنیوا سے نکالتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہت سی کتابیں عربی اور انگریزی میں شائع کی ہیں :

Dr Abdul Hakim Tabibi, 81, Rue De Lyon, Ch.
1203, Geneva. Tel. (022) 442268, (022) 983911

ڈاکٹر طبیبی نے اصرار کیا کہ میں جنیوا میں مزید قیام کروں اور ان کے "گیسٹ ہاؤس" میں ٹھہروں۔ اس طرح مجھے مزید تفصیل سے سوئزرلینڈ کو جاننے کا موقع مل جاتا نیز دعوتی کام کے مزید مواقع ملتے۔ مگر میرے لیے زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہ تھا۔ اس لیے میں ان کی پیش کش کو قبول نہ کر سکا۔ ڈاکٹر طبیبی کی لائبریری کے لیے میں نے اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات پیش کیں۔ ان میں "تبلیغ مومنٹ" کا ایک نسخہ بھی شامل تھا۔

یہاں کی ملاقاتوں میں سے ایک دل چسپ ملاقات وہ تھی جو مسٹر مک کی

سے ہوئی :

Richard Mc Kee, U.S. Mission, 11, route de Pregeny
1292 Chambesy, Geneva, Switzerland.

مسٹر مک کی امریکی ہیں اور امریکی سفارت خانہ میں مشیر کی حیثیت سے متعین ہیں۔ گفتگو کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ وہ عربی زبان جانتے ہیں۔ ان سے چند ملاقاتیں ہوئیں اور ہر بار ان سے عربی میں گفتگو ہوتی رہی۔ وہ روانی کے ساتھ عربی بولتے ہیں۔ انھیں مجھ سے کچھ کہنا ہوتا تو خالص عربی انداز میں "حضرتکم" کے لفظ سے خطاب کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی عرب بول رہا ہے۔ ایک بار تقریباً آدھ گھنٹہ کی گفتگو میں وہ بے تکلف اپنے خیالات کا اظہار عربی میں کرتے رہے۔ ان کو دینے کے لیے میرے پاس عربی کی کوئی کتاب نہ تھی۔ البتہ میں نے انھیں الرسالہ انگریزی کے چند شمارے دیے۔

۸ دسمبر کی شام کو میں ہوٹل کے ایک مقام سے گزر رہا تھا کہ ایک سفید فام امریکی خاتون نے مجھے مخاطب کیا۔ میری ٹوپی اور میرے حلیہ سے اس نے مجھے ایک مذہبی اور روحانی شخصیت سمجھا اور اسی انداز میں گفتگو شروع کی۔ اس نے نہایت سنجیدہ انداز میں اپنے خیالات پیش کیے۔ وہ امریکہ کی نئی نسل کی نمائندہ تھی۔ اس نے بتایا کہ سچائی کی تلاش میں وہ اپنے کئی امریکی ساتھیوں کے ہمراہ مختلف ملکوں کا سفر کر چکی ہے۔ اس نے کہا کہ میری نسل روحانی اصول کو جاننے کی تلاش میں ہے۔ ہم نے جان لیا ہے کہ زندگی کے لیے مادیت سے زیادہ کچھ درکار ہے۔ چنانچہ ہم نے مایوسانہ طور پر سچائی کی تلاش کی (مگر سچائی ہم کو نہیں ملی) :

My generation was on a quest to understand spiritual law.
We knew there was more to life than materialism. So,
we searched desperately for the Truth.
Miss Renee Elaine Thompson, 3906 Ernst St.,
Omaha, Nebraska 68112, U.S.A.

گفتگو کے آخر میں میں نے خاتون کو الرسالہ (انگریزی) کے چند شمارے اور بعض انگریزی کتابیں دیں۔ انھوں نے بہت دل چسپی کے ساتھ لیا اور شدت شوق میں اسی وقت پڑھنے لگیں۔ یہ واقعہ شاید میرے اس پورے سفر کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ تھا۔ اس واقعہ میں مجھے جدید انسان کی روح تڑپتی ہوئی نظر آئی۔

کتابوں میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب میں کچھ لوگ تھے جن کو حنفار کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ عرب کے جاہلی دین پر مطمئن نہ تھے۔ ان کی فطرت سچے دین کی تلاش میں تھی۔ زید بن عمرو یہ کہتے ہوئے مرگیے کہ خدایا، اگر میں جانتا کی تیری پسندیدہ عبادت کیا ہے تو اسی طرح میں تیری عبادت کرتا، مگر میں اس کو نہیں جانتا۔ ایک مرتبہ اس طرح کے کچھ لوگ جمع ہوئے۔ انھوں نے آپس میں کہا: جان لو کہ خدا کی قسم، تمہاری قوم کسی چیز پر نہیں ہے۔ انھوں نے دین ابراہیم کو بگاڑ دیا ہے۔ پس نکلو اور سچے دین کو تلاش کرو۔ چنانچہ وہ لوگ مختلف ملکوں کی طرف نکل پڑے (سیرۃ ابن ہشام، سیرۃ ابن کثیر، جلد اول)

جنیوا کے مذکورہ تجربہ کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ عرب کے حنفار کی طرح دور جدید میں دوبارہ حنفار کی ایک نسل پیدا ہو گئی ہے جو زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ خدایا، مجھے نہیں معلوم کہ کس طرح میں تیری عبادت کروں۔ اگر میں جانتا تو میں اسی طرح تیری عبادت کرتا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ جدید انسان کی رہنمائی کا انتظام فرمائے، اور بلاشبہہ وہی انتظام فرمانے والا ہے۔

اس دوران میری ملاقات ایک امریکی سیاح سے ہوئی۔ وہ پروٹسٹنٹ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں ان سے میں نے پوچھا کہ آپ دنیا کے بہت سے ملکوں میں گیے ہیں، آپ کو سب سے زیادہ کون سا ملک پسند آیا۔ انھوں نے کہا کہ سوئزر لینڈ مجھ کو سب سے زیادہ پسند آیا۔ بے حد صاف، بے حد مستعد (Very neat, very efficient) پھر میں نے انڈیا کے بارہ میں پوچھا۔ انھوں نے ہنس کر کہا کہ میں نے انڈیا کا سفر کیا ہے۔ انڈیا کی بہت سی چیزیں مجھے پسند ہیں۔ مگر وہاں بیورو کریسی اتنی زیادہ ہے کہ اس کی مثال کہیں اور نہیں ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ سوئزر لینڈ میں بھی قواعد و ضوابط بہت زیادہ ہیں۔ مگر سوئزر لینڈ کے کسی سرکاری دفتر میں آپ ایک کام کے لیے جائیں تو ایک آدمی کی میز پر پہونچ کر آپ کا سارا کام ۱۰ منٹ میں پورا ہو جائے گا۔ جب کہ انڈیا میں میں دوبار گیا ہوں۔ وہاں کے کسی سرکاری دفتر میں جائیے تو ہر آدمی آپ کو دوسرے آدمی کے پاس بھیجے گا۔ آپ ایک آدمی سے دوسرے آدمی اور دوسرے آدمی سے تیسرے آدمی کے پاس جاتے رہیں گے پھر بھی یقینی نہیں ہے کہ آپ کا کام آپ کی مرضی کے مطابق ہو جائے۔

جنیوا ایک بے حد صاف ستھرا شہر ہے۔ یہاں کے بارے میں ایک دلچسپ لطیفہ معلوم ہوا۔

ایک صاحب ڈپلومیٹ تھے وہ اپنے خاندان کے ساتھ یہاں شہر کے باہر پکنک کے لیے گئے۔ وہاں ان لوگوں نے کچھ کھایا پیا اور اس کے بعد ڈبہ اور کاغذ کی قسم کی بچی ہوئی چیزیں چھوڑ کر قریب کی کسی جگہ ٹہلنے چلے گئے۔ البتہ ان کی کار وہیں پاس کھڑی ہوئی تھی جس پر ڈپلومیٹک نشان لگا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ لوگ ٹہل کر اپنے مقام پر دوبارہ واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کی کار کی ونڈ اسکرین پر ایک کاغذ چپکا ہوا ہے جس کے اوپر یہ الفاظ تحریر ہیں:

Having a diplomatic licence does not give you permission to litter the countryside.

۹ دسمبر کو دوپہر بعد جنیوا شہر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک مقامی گائڈ کی رہنمائی میں ہم چند آدمی نکلے۔ گاڑی ہم کو سارے شہر میں گھماتی رہی۔ ایک مقام پر اتر کر وہاں کا بڑا چرچ دیکھا۔ جنیوا اگرچہ نسبتاً چھوٹا شہر ہے۔ مگر وہ غیر معمولی طور پر صاف اور خوبصورت ہے۔ اگرچہ شہر کا پرانا حصہ اتنا صاف نظر نہیں آیا جتنا اس کا نیا حصہ صاف تھا۔ تاہم دونوں میں فرق بہت کم تھا۔ ایک مقام پر مسجد بھی دیکھی۔ یہ مسجد کافی وسیع ہے اور جدید انداز میں تعمیر کی گئی ہے۔ اس کا افتتاح حال میں شاہ فہد نے کیا ہے۔ یہ خوبصورت مسجد جنیوا کے معیار کے مطابق بنائی گئی ہے۔ اور شہر کے مرکزی علاقہ میں واقع ہے۔

جنیوا میں میں نے اپنے ہوٹل کے کمرہ سے کچھ مقامی ٹیلی فون کیے تھے۔ بظاہر اس ٹیلی فون کا علم یا تو مجھ کو تھا یا شہر کے اس آدمی کو جس سے میں نے ٹیلی فون پر بات کی تھی۔ مگر ہوٹل سے روانگی کے وقت جب میں ہوٹل کے کاغذات پر دستخط کرنے کے لیے اس کے دفتر میں گیا تو وہاں ٹیلی فون کی تعداد اور اس کی رقم نہایت صحت کے ساتھ ایک کاغذ پر درج شدہ موجود تھی۔ یہ کمپیوٹر کا کرشمہ ہے۔ بڑے ہوٹلوں میں ہر کمرہ کمپیوٹر سے مربوط رہتا ہے اور کمپیوٹر آٹومیٹک طور پر ہر چیز کو ریکارڈ کرتا رہتا ہے۔ یہی معاملہ آخرت کا بھی ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی ایک عمل کرتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی اور نہیں جو اس کے عمل کو جانے۔ مگر خدا کے مخفی فرشتے ہر جگہ تیسرے فریق کی حیثیت سے موجود ہیں اور اس کے ہر قول و عمل کو نہایت صحت کے ساتھ ریکارڈ کر رہے ہیں۔ آدمی جیسے ہی موجودہ دنیا کو چھوڑے گا، خدا کے یہ

ملکوتی کمپیوٹر اس کی مکمل چارج شیٹ اس کے سامنے رکھ دیں گے ۔

مغربی دنیا میں شراب اس قدر عام ہے کہ عملاً شراب اور پانی میں کوئی فرق باقی نہیں ۔ میرے ہوٹل کے کمرے میں ایک چھوٹی الماری تھی جس کے اوپر لکھا ہوا تھا (Mini Bar) میں نے اس کو کھولا تو الماری کے تمام خانے مختلف قسم کے شراب کی بوتلوں سے بھرے ہوئے تھے ——— جدید میڈیکل سائنس نے شراب کا مضر ہونا ثابت کر دیا ہے ۔ مگر جو چیز انسان کی عادت بن جائے اس کو چھوڑنا انسان کے لیے سب سے زیادہ مشکل کام ہوتا ہے ۔

۱۰ دسمبر کی صبح کو جنیوا سے واپسی ہوئی ۔ جنیوا کا ہوائی اڈہ بے حد صاف اور منظم تھا ۔ ٹائلیٹ سے لے کر نشانات راہ تک ہر چیز اتنی نفیس حالت میں تھی جو مجھے کسی اور ہوائی اڈے پر نظر نہیں آئی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی استعمالی ایرپورٹ نہیں ہے بلکہ نمونہ کا ایرپورٹ ہے جو بنا کر نمائش کے لیے رکھ دیا گیا ہے ۔ ہندستان کے مقابلہ میں سوئزرلینڈ کے وسائل بہت کم ہیں ۔ مگر محدود وسائل کے دانش مندانہ استعمال نے اس کو ہندستان سے زیادہ خوبصورت ملک بنا دیا ہے ۔

دہلی کا جہاز پکڑنے کے لیے ہمیں فرینکفرٹ آنا تھا ۔ جنیوا سے فرینکفرٹ کا سفر لفتھانزا کی فلائٹ نمبر ۲۴۹ کے ذریعہ ہوا ۔ یہ جرمن کمپنی کا جہاز تھا اور جرمنی کی ترقی کا پوری طرح نمائندہ تھا ۔ اس وقت فضا میں گہرا بادل اور کہر چھایا ہوا تھا ۔ آگے کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی ۔ اس کے باوجود جہاز نے اپنا سفر اس طرح طے کیا جیسے اس کے پائلٹ کو سب کچھ دکھائی دے رہا ہو ۔ اس قسم کا سفر موجودہ زمانہ میں وائرلیس کی ترقی کے ذریعہ ممکن ہوا ہے ۔ ہوائی اڈہ پر خاص طرح کے رڈار ہوتے ہیں جو مسلسل ناقابل مشاہدہ لہریں پھینکتے رہتے ہیں ۔ یہ لہریں ہوائی جہاز سے ٹکراتی ہیں اور اس کی اس طرح رہنمائی کرتی ہیں جیسے کوئی آنکھ والا کسی اندھے کا ہاتھ پکڑ کر اس کا سفر طے کرا رہا ہو ۔ مادی اعتبار سے آج کا انسان اندھیرے میں سفر کرنے کے قابل ہو گیا ہے ، مگر روحانی اعتبار سے وہ اجالے میں سفر کرنے کے قابل بھی نہ ہو سکا ۔

فرینکفرٹ مغربی جرمنی کا ایک اہم صنعتی شہر ہے ۔ اس کو رومیوں نے پہلی صدی قبل مسیح میں آباد کیا تھا ۔ تاہم اس کو زیادہ شہرت نویں صدی عیسوی میں حاصل ہوئی جب کہ جرمن بادشاہوں

نے اس کو اپنا سیاسی مرکز بنایا۔ موجودہ زمانہ میں بین اقوامی تجارتی نمائشوں کی وجہ سے فرینکفرٹ نے کافی شہرت حاصل کی ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران ۱۹۴۴ میں اس پر زبردست بمباری ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں فرینکفرٹ بالکل تباہ ہوگیا۔ مگر اس بربادی میں ترقی کا نیا امکان نکل آیا۔ اس نے جرمنوں کو موقع دیا کہ وہ اپنے قدیم شہر کو دوبارہ جدید طرز پر آباد کریں۔ موجودہ منظم اور پررونق شہر جنگ کے بعد اس کے کھنڈروں سے برآمد ہوا ہے۔ مشہور جرمن شاعر گوئٹے (Goethe) فرینکفرٹ میں ہی ۲۸ اگست ۱۷۴۹ کو پیدا ہوا تھا۔ اس کا پیدائشی مکان تاریخی یادگار کے طور پر محفوظ رکھا گیا تھا۔ مگر وہ بھی دوسری عالمی جنگ میں جل کر تباہ ہوگیا۔ جرمنوں نے اس کو دوبارہ اس کے سابقہ نمونہ پر بنا دیا ہے۔

فرینکفرٹ میں جرمنی کا سب سے بڑا ایرپورٹ ہے۔ لندن اور پیرس کے بعد فرینکفرٹ کو یورپ میں تیسرے سب سے بڑے ایرپورٹ کی حیثیت حاصل ہے۔ سالانہ ایک کرور سے زیادہ مسافر یہاں کے ایرپورٹ سے گزرتے ہیں۔ فرینکفرٹ میں نوے ہزار سے زیادہ بیرونی ملکوں سے آئے ہوئے لوگ آباد ہیں۔ ان میں تقریباً ۱۶ فی صد ترک ہیں۔

فرینکفرٹ سے دہلی کے لیے لفتھانسا کی فلائٹ نمبر ۶۶۲ کے ذریعہ سفر ہوا۔ یہ آٹھ گھنٹہ کی طویل پرواز تھی۔ تاہم سفر بآسانی طے ہوگیا۔ ہندستان کے اندر انڈین ایرلائنز سے سفر کرتے ہوئے کئی بار میرے ساتھ یہ قصہ پیش آیا کہ ایرپورٹ پر پہونچ کر معلوم ہوا کہ فلائٹ روک دی گئی ہے۔ کیوں کہ آگے جس ہوائی اڈہ پر اس کو اترنا ہے وہاں کہر کی وجہ سے رویت (Visibility) کم ہے۔ مغربی ملکوں میں اگر یہ چیز رکاوٹ بنے تو وہاں روزانہ ہی فلائٹ روکی جاتی رہیں۔ کیوں کہ وہاں تو اکثر فضا میں کہر چھایا ہوا ہوتا ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں رڈار (Radar) اور کمپیوٹر کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کر لیا گیا ہے۔ جنیوا اور فرینکفرٹ دونوں جگہ ایسا ہوا کہ ہمارا جہاز وہاں پہونچا تو فضا کے اوپر گہرا کہر چھایا ہوا تھا۔ مگر جہاز کو لینڈ کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

اس مسئلہ کا حل اس نظام کے ذریعہ نکال لیا گیا ہے۔ جس کو آج کل فی الفور نظام

(On the line system) کہا جاتا ہے ۔ اس نظام میں جہاز کو صحیح مقام پر اتارنے کا کام انسانی آنکھ کے بجائے مشینی آنکھ کرتی ہے ۔ ہوائی اڈہ پر لگا ہوا رڈار لہریں پھینکتا ہے ۔ یہ لہریں ہوائی جہاز سے ٹکرا کر لوٹتی ہیں تو رڈار سے متصل کمپیوٹر ان کا تجزیہ کرکے جان لیتا ہے کہ ہوائی جہاز کا رُخ ، اس کی بلندی وغیرہ کیا ہے ۔ اس تجزیہ کے مطابق وہ وائرلیس پر جہاز کے مشینی نظام کو رہنمائی دیتا ہے کہ وہ اپنے رخ اور بلندی میں کیا تبدیلی کرے کہ وہ صحیح مقام پر صحیح رُخ سے اتر سکے ۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے جس کا ہر جزء ایک سکنڈ کے دس لاکھویں حصہ میں انجام پاتا رہتا ہے ، اسی لیے اس کو مائیکرو سکنڈ (Micro second) کہا جاتا ہے ۔

ایک الکٹرانک انجینیر نے کہا : آٹومیشن کا بیسک کانسپٹ بے خطا نظام (Error-free system) کو وجود میں لانا ہے ۔ ایک انسان لازماً غلطی کرتا ہے ۔ لیکن مشین کی صورت میں غلطی کا امکان بہت زیادہ کم ہو جاتا ہے :

A man is bound to make error, but by machine,
this probability gets very much reduced.

فرینکفرٹ میں ایک ہندستانی مسٹر ورما سے ملاقات ہوئی ۔ وہ بھوپال کے رہنے والے ہیں اور شکاگو (امریکہ) میں تجارت کرتے ہیں ۔ ان سے میں نے پوچھا کہ ہندستان میں اور امریکہ میں کیا فرق ہے ۔ انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں کوئی کام کرنا بے حد آسان ہے اور ہندستان میں کام کرنا بے حد مشکل ۔ انھوں نے کہا کہ میں نے ہندستان میں ایک انڈسٹری لگائی ہے ۔ مگر اس کو لگانے کے لیے دفتری لڑائی میں مجھے دس سال بیت گئے ۔ جب کہ ان کے بیان کے مطابق ان کے وزیروں تک سے تعلقات تھے ۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ میں عام آدمی کو بھی وہی مواقع حاصل ہیں جو خواص کو ۔ جب کہ ہندستان میں رشوت اور بیوروکریسی اتنی زیادہ ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں ۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت امریکہ میں ہندستانی لوگ بہت بڑے بڑے کام کر رہے ہیں ۔ یہ سب ہندستان واپس آسکتے ہیں اور اپنے دیش کو ترقی دے سکتے ہیں ۔ مگر جو شخص واپس آتا ہے وہ اتنی مشکلوں میں پھنس جاتا ہے کہ اس کے سارے حوصلے پست ہو جاتے ہیں ۔ اس سلسلے میں انھوں نے کئی قصے سنائے ۔

میں نے سوچا کہ مغرب اور ہندستان کے درمیان یہ فرق ہے کہ مغرب کی مثال زندہ جسم کی ہے اور ہندستان کی مثال مردہ جسم کی۔ ہندستان گویا جگسا پزل کے ٹکڑوں کے ذریعہ بننے والا جسم ہے۔ زندہ جسم ایک مربوط کل ہوتا ہے۔ اس کا ہر حصہ اس طرح عمل کرتا ہے کہ وہ دوسرے کے حصہ کا کام بھی کر سکے۔ اس کے برعکس ہندستان کے افراد جگسا پزل کے الگ الگ ٹکڑوں کی مانند ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو صرف اپنی خبر ہے، کسی کو بھی نہ تو دوسرے کے وجود کی خبر ہے اور نہ وہ اس کے سلسلہ میں اپنی کوئی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ یہی وہ فرق ہے جس نے مغرب کے عام انسان کی زندگی کو عافیت کی زندگی بنا دیا ہے اور ہندستان کے عام انسان کی زندگی کو بے عافیت کی زندگی۔

اس سفر میں مجھے مغرب کے تین بڑے مراکز میں جانے کا اتفاق ہوا۔ لندن (انگلینڈ) جنیوا (سوئزرلینڈ) اور فرینکفرٹ (جرمنی) سفر کے خاتمہ پر جنیوا سے میں ۱۰ دسمبر ۱۹۸۶ کو صبح سات بجے روانہ ہوا۔ واپسی کے سفر میں مجموعی طور پر تقریباً ۱۵ گھنٹے لگے۔ اس لحاظ سے مجھے ۱۰ بجے رات تک دہلی پہونچ جانا چاہئے تھا۔ مگر میں دہلی پہونچا تو یہاں کی گھڑیوں میں رات کے ½۲ بج رہے تھے۔ یہ اس لیے ہوا کہ ہندستان اور سوئزرلینڈ کے وقت میں ساڑھے چار گھنٹہ کا فرق ہے۔

اعلان

الرسالہ یا الرسالہ کیسٹ یا الرسالہ کی مطبوعات کے سلسلہ میں ہم نے کسی کو پیشگی رقم وصول کرنے کا مجاز نہیں بنایا ہے۔ اس لیے کوئی صاحب کسی شخص کو پیشگی رقم ادا نہ کریں۔ رقم کے سلسلہ میں براہ راست مرکز دہلی سے رجوع فرمائیں۔

سکریٹری اسلامی مرکز

لوگ چندہ نہیں دیں گے

پھلواری شریف کے چند نوجوان جلسۂ سیرت کا پروگرام بنا رہے تھے، ان کا جذبہ یہ تھا کہ پھلواری شریف ایک تاریخی بستی ہے، لہٰذا جلسہ بھی تاریخی نوعیت کا ہونا چاہیے۔ ایک اخبار کے ایڈیٹر لکھتے ہیں کہ میں نے ان سے پوچھا کہ کتنا روپیہ خرچ کروگے، جواب ملا کہ تقریباً پانچ ہزار روپیہ چندہ ہو جائے گا۔ میں نے کہا بلاشبہ ہمارے لیے یہ بات باعثِ فخر ہے کہ ہم حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہیں۔ ان کی محبت ہماری سب سے قیمتی متاع ہے۔ لیکن ان کی یاد کو تازہ رکھنے، ان کے اسوۂ حسنہ کو عام کرنے کے لیے جلسہ ہی کیا ضروری ہے، پھلواری شریف میں کوئی اچھی لائبریری نہیں، اتنی رقم سے ایک اچھی لائبریری کی بنیاد ڈالی جاسکتی ہے جس میں سیرت پر اعلیٰ درجہ کا لٹریچر ہو اور اسی لائبریری میں تعلیم بالغان کا ایک مرکز بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ جلسہ کی تقریریں ہوا میں تحلیل ہو جائیں گی، لائبریری کا فیض پورے سال بھر لوگوں کو پہونچتا رہے گا۔ نوجوان میری بات کے قائل ہو گئے، تاہم وہ اپنے پروگرام کو بدلنے پر راضی نہیں ہوئے۔ انھوں نے کہا "لیکن لائبریری کے لیے لوگ چندہ نہیں دیں گے، جب کہ میلاد النبی کے جلسہ کے لیے آسانی سے رقم فراہم ہو جائے گی" (نقیب، پٹنہ، ۱۶ جنوری ۱۹۷۸)

اس واقعہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ لوگ چندہ نہیں دیں گے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ لوگ چونکہ اس کے لیے چندہ نہیں دیں گے اس لیے ہمیں وہی کام کرنا ہے جس میں لوگ چندہ دیں۔

یہ چھوٹا سا واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کی وجہ کیا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جو لوگ مسلمانوں میں کام کرنے کے لیے اٹھتے ہیں وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر انھیں کاموں کی طرف چلے جاتے ہیں جن میں چندہ زیادہ جمع ہوتا ہو، جن میں شہرت زیادہ ملتی ہو، جن میں عوام کی بھیڑ زیادہ اکٹھا ہوتی ہو، جن میں فوراً اسے فوراً لیڈری حاصل ہو جائے۔ عوام کے اس مزاج کو بدلنے کی واحد صورت یہ ہے کہ ان کے رہنما اپنا مزاج بدلیں۔ وہ ایسے کاموں میں طاقت لگائیں جن میں "چندہ" نہیں ملتا۔ ایک نسل جب اس طرح قربانی دے گی، اس کے بعد ہی وہ وقت آئے گا جب کہ اگلی نسل اس کا پھل پاسکے۔

خبرنامہ اسلامی مرکز — ۲۸

۱۔ صدر اسلامی مرکز نے ورلڈ کونسل آف ریلیجس لبرٹی (نیویارک) کی دعوت پر دسمبر ۱۹۸۶ میں سوئزرلینڈ کا دورہ کیا تھا۔ اس سفر کی روداد کی پہلی قسط فروری ۱۹۸۶ کے شمارہ میں چھپ چکی ہے۔ اس سفر کی دوسری اور آخری قسط زیر نظر شمارہ میں دی جا رہی ہے۔

۲۔ صدیقی ٹرسٹ (کراچی) الرسالہ کے مختلف مقالات کو پمفلٹ کی صورت میں چھاپ کر مفت تقسیم کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے شائع کردہ کئی پمفلٹ ہمارے دفتر میں موصول ہو چکے ہیں۔

۳۔ ۱۰ جنوری ۱۹۸۷ کو گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں تعلیم یافتہ اصحاب کا ایک اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر ایک تقریر کی۔ اس میں قرآن و حدیث کی روشنی میں بتایا کہ مسلمانوں کے کرنے کا اصل کام کیا ہے۔

۴۔ "بابری مسجد ایکشن کمیٹی" نے مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ ۲۶ جنوری ۱۹۸۷ کو ریپبلک ڈے کا بائیکاٹ کریں اور اس طرح بابری مسجد (اجودھیا) کے معاملہ میں حکومت کے خلاف اپنی ناراضی کا اظہار کریں۔ یہ ایک غیر دانش مندانہ فیصلہ تھا۔ چنانچہ مختلف سنجیدہ افراد نے اس کے خلاف بیانات دیئے۔ صدر اسلامی مرکز نے بھی اس سلسلہ میں ایک اختلافی بیان دیا جو مختلف اخبارات (ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس، اسٹیٹسمین وغیرہ) میں شائع ہوا اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اصل اشو سے اتفاق کرتے ہوئے موجودہ طریق کار کو غلط قرار دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بابری مسجد ایکشن کمیٹی کو اپنے موقف کی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے ۲۴ جنوری ۱۹۸۷ کی شام کو اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔

۵۔ اسلامی مرکز کے پیغام کو اللہ تعالیٰ بے شمار طریقوں سے پھیلا رہے ہیں۔ مثلاً ڈیرہ اسماعیل خاں، صوبہ سرحد سے جناب فضل مسعود خاں کا خط (۱۷ نومبر ۱۹۸۶) ہم کو ملا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ "چند مہینے پہلے میں نے مولانا وحید الدین صاحب کی کتاب (مذہب اور جدید چیلنج) پڑھی جو مجھے بے حد پسند آئی۔ اس کے بعد ابھی نومبر ۱۹۸۶ کے پہلے ہفتہ

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

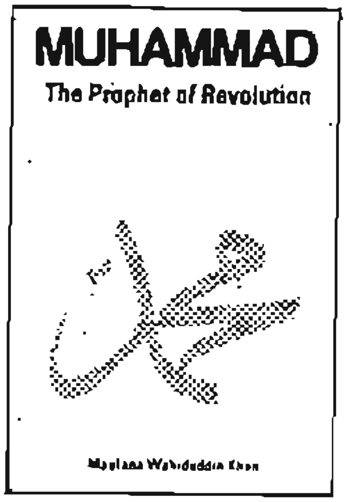
۴۔ صاحبِ استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرتعاون الرسالہ

زرتعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا



MUHAMMAD

The Prophet of Revolution

By

Maulana Wahiduddin Khan

In making the Prophet Muhammad the greatest figure, and consequently one of the most resplendent landmarks in human history, God has bestowed his greatest favour on mankind. Whoever seeks guidance cannot fail to see him, for he stands out like a tower, a mountain on the horizon, radiating light like a beacon, beckoning all to the true path. It is inevitable that the seekers of truth will be drawn up to the magnificent pinnacle on which he stands.

ISBN 81-85063-00-1 (PB Rs 50 $ 5)
ISBN 81-85063-07-9 (HB Rs 90 $ 9)

Maktaba Al-Risala
C-29 Nizamuddin West New Delhi-110013

DSE 243 R.N. No. 28822/76 March 1987 No. 124

GIFTING The Word of God



To spread the word of God is the highest form of charity. It appeals to the mind, the heart, the soul, that being the earnest endeavour of this magazine, how noble-spirited it would be of you, dear readers, if you sent it on regularly to friends and relatives. Make a **GIFT** of it. Think of a whole year's subscription as being both a delightful present as well as a contribution to a worthy cause.

Please send AL-RISALA to my friend/ relative to the following address:

Name ....

Address ....

....

....

(Please use separate sheet for more than one address)

I am enclosing cheque/Postal Order/ Bank Draft/M.O. Receipt No. ....

Please tick box where applicable

☐ URDU
☐ ENGLISH
☐ ONE YEAR
☐ TWO YEARS

Annual Subscription Rates

INLAND	RS. 48
ABROAD	
By air-mail	$ 20
By surface mail	$ 10

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
ALRISALA C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

GIFT AL-RISALA TO YOUR FRIENDS & RELATIVES

Rs 4